سید قطب شہیدؒ   مترجم: عبد الحمید صدیقی

ادارہ معارفِ اسلامی، کراچی

البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

اشاعتِ دوم ۱۰۰۰ دسمبر ۸۷ء

ناشر عبدالحفیظ احمد

طابع اللہ والا پرنٹرز لاہور

قیمت ۶/- روپے

اِدارہ معارفِ اِسلامی

ادارۂ معارفِ اسلامی (رجسٹرڈ) ایک آزاد علمی وتحقیقی ادارہ ہے جو اسلام کی حقیقی اور بے آمیز تعلیمات کو دورِجدید کی زبان میں پیش کرنے اور اسلام کی رہنمائی میں آج کے معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے علمی کام میں معروف ہے۔ اِس ادارہ کا قیام ۱۹۶۳ء میں عمل میں آیا۔ ایک بااختیار مجلس منتظمہ اس کے تمام اُمور کی ذمہ دار ہے۔ ادارہ کا مرکزی نظم کراچی میں ہے اور مختصر شاخ ڈھاکہ میں کام کر رہی تھی لیکن سقوطِ مشرقی پاکستان کے سبب اب اس سے ادارہ کا رابطہ ٹوٹ گیا جن مقاصد کے حصول کے لیے ادارہ کوشاں ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلامی تعلیمات کو پوری تحقیق اور علمی جستجو کے بعد جدید ترین اُسلوبِ اظہار کو اختیار کرتے ہوئے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دُوسرے دائرُوں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں پیش کرنا۔

۲۔ علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیبِ نو، تشریح وتوضیح اور اشاعت۔ اس طرح قدیم علمی خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی کا سامان کرنا۔

۳۔ عالمِ اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسند از فہم پیدا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔

۴۔ اسلامی موضوعات پر دورِحاضر کے مسلم علماء کے نمایاں کارناموں کی وسیع اشاعت اور نفوذ کی خاطر دُنیا کی اہم زبانوں میں بالخصوص عربی، اُردو، انگریزی،

فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں اُن کے ترجمہ اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدّن، تاریخ اور مسلم دُنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

۶۔ تعلیم کو مثبت اِسلامی آہنگ دینے کے لیے اور اسلامی بُنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظامِ تعلیم کے اِرتقاء کی راہ ہموار کرنے کے لیے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

مندرجات

پیش لفظ

انسانیت کے دشمنوں نے اسلام کے خلاف جو طوفان برپا کر رکھا ہے ممکن ہے آج کے بعض دردمندوں کے لیے پریشانی کا سبب ہو لیکن اسلام کے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ اس نے اپنی طویل زندگی میں ایسے طوفان نہ جانے کتنی بار سر سے اونچے ہوتے دیکھے ہیں اور ہر بار پاؤں میں نمی کا داغ تک لیے بغیر نکل آیا ہے۔ چنگیز و ہلاکو کا دور ہو یا سقوط اندلس کا زمانہ۔ الجزائر اور لیبیا کی بربادی کا سانحہ ہو یا مشرقی پاکستان کی تباہی کا۔ ماضی بعید کی طوفانی راتیں ہوں یا ماضی قریب کی کالی گھٹائیں۔ قدیم دور کی مغلوب تہذیبیں ہوں یا دورِ حاضر کے سائنسی ایجادات و اکتشافات میں پناہ گزیں مادہ پرست تہذیب ہر دور میں اسلام سرفراز رہا جن تلواروں نے مسلمانوں کو کاٹا وہی تلواروالے ہاتھ بالآخر اسلام پھیلانے کا سبب بنے۔ دشمنوں کے گھروں ہی میں اس کے چراغ جلے ہیں اور وہیں سے اس کو پاسبانِ حرم ملے ہیں۔

"اسلام کا روشن مستقبل" کتاب میں فاضل مصنف نے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ تہذیب جدید اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ سامنے آچکی ہے اور نظر فریب سامانِ حیات کے باوجود غیر دلچسپ بن چکی ہے اور یہ کہ اس کے رسیا اس

کے بھیانک نتائج سے پریشان بھی ہیں اور اپنی کھلی نگاہوں سے اسلام کو مد مقابل دیکھ کر حیران بھی ہیں اور اپنے سابقہ تجربوں کی بناء پر وہ جانتے بھی ہیں کہ اسلام کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں اس لیے پہلے کی طرح اب بھی مسلمانوں کے درپے آزار ہیں۔ اس نازک مرحلہ پر مسلمان اگر اللہ تعالیٰ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لیں تو وہ غالب قوت بن کر اُبھر سکتے ہیں اور دنیا کی قیادت اور امامت ایک بار پھر ان کی دہلیز پر پہنچ سکتی ہے۔

یہ کتاب عربی زبان میں سید قطب شہید نے لکھی اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے اس کو اُردو کا قالب دیا۔ عربی کے مصنف کی طرح اُردو کے یہ مترجم بھی افسوس ہے کہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے وقت ان کو مرحوم لکھتے ہوئے دلی کرب محسوس ہوتا ہے اور انا للہ وانا الیہ راجعون ہی میں سہارا ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو بھی ان کے لیے سرمایۂ عاقبت بنائے اور بہترین اجر سے نوازے اور مسلمانوں کو جلد از جلد اس قابل بنائے کہ وہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو ضلالت کی راہ سے نکال کر سعادت کی راہ پر لگا سکیں اور فتح و کامرانی سے ہمکنار کر سکیں۔ آمین

منور حسن

سیکرٹری ادارہ معارف اسلامی

دیباچہ

"المستقبل لہذا الدین" کے فاضل مصنف سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُنہوں نے اسلام کی صداقت کے ثبوت میں متعدد علمی کُتب تصنیف کی ہیں جن میں سے اکثر علمی حلقوں میں بیحد مقبول ہوئی ہیں۔ جو شخص بھی انہیں خلوص نیت سے پڑھتا ہے وہ ان سے متأثر ہُوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے ایک ایک حرف سے مصنف کی اسلام کے ساتھ سچی اور گہری وابستگی جھلکتی ہے۔ سید قطبؒ کو اسلام سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع یعنی جان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے غیر متزلزل ایمان کی شہادت کے طور پر پیش کر دی۔ رب العالمین ان کی اس سرفروشی کو قبول فرمائے اور انہیں آخرت میں فائز المرام کرے۔

یہ کتاب جس کا اُردو ترجمہ ان اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے مصنف کے اسلام پر پختہ ایمان اور اس کے روشن مستقبل کے بارے میں لازوال یقین کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

سید قطبؒ کی اس تحریر میں عربی خطابت کی ساری خصوصیات موجود ہیں یعنی جذبات کا سیلِ بے پناہ اور الفاظ اور خیالات کا تکرار۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں کوشش کے باوجود ترجمے میں مصنف کے جذبات کی پُوری طرح عکاسی نہیں کر سکا۔

اس کام میں میرے محترم اور فاضل دوست مولینا عبداللہ کوثر صاحب نے جس خلوص کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا ہے اس کے لیے میں اُن کا بیحد ممنون ہُوں۔ کتاب کو پہلی مرتبہ اُردو میں ڈھالتے

وقت ترجمے کے بجائے ترجمانی کا انداز اختیار کیا گیا تھا مگر جب مسودہ تیار ہو کر اکادمی کے دفتر میں پہنچا تو بعض احباب نے اس آزاد ترجمانی کو مصنف کے ساتھ ناانصافی قرار دیا۔ خود مجھے بھی ان کی اس رائے میں بڑا وزن محسوس ہوا۔ چنانچہ آزاد ترجمانی کو ترجمے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس مرحلے میں اگر صاحب موصوف میری بھرپور معاونت نہ کرتے تو کام کی تکمیل میں کافی تاخیر ہو جاتی۔ انہوں نے سارے مسودے پر نظر ثانی کی اور آزاد ترجمانی کو ترجمے کی صورت میں ازسر نو مرتب کیا۔

اس کتاب کا ترجمہ "ادارہ معارف اسلامی" کی زیر نگرانی اور ہدایت کے مطابق کیا گیا ہے اس ادارے کے ناظمین خصوصاً چودھری غلام محمد صاحب مرحوم و مغفور اور جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب اور دوسرے رفقا کار نے مجھ سے جو حسنِ سلوک اور تعاون کیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا سخت ناسپاس گزاری ہوگا۔ باری تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

میں اسے اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ "ترجمان القرآن" کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہر قدم پر مخدومی مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے بالغ نظر عالم کی رہنمائی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے جو ابواب "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئے اُن پر نہ صرف محترم مولینا نے نظر ثانی فرمائی بلکہ اس سلسلے میں مجھے مفید مشورے بھی دیے جن کے لیے میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔

۴، ذالحجہ ۱۳۹۱ھ

خاکپائے رحمۃ اللعالمین
عبدالحمید صدیقی

۲۔ اسلام ایک اسلوبِ حیات

اسلام ایک اسلوب ہے، اسلوبِ حیات، حیاتِ انسانی اور اس کی اقدار۔ ایسا اسلوب جس میں وہ اعتقادی تصور بھی شامل ہے جس سے کائنات کی ماہیت واضح اور اس میں انسان کا مرتبہ و مقام اور اس کے وجود کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے۔ یہ اسلوبِ حیات ایسی تمام تنظیمات کی صورت گری کرتا ہے جن کا سرچشمہ اسلام کا اعتقادی تصور ہے اور جن کی مدد سے یہ اسلوبِ حیات عملی زندگی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان تنظیمات میں اخلاقی نظام، اس کی اساس اور اس کا سرچشمہ وہ قوتِ قاہرہ ہے جو اس کے نفاذ میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے یعنی سیاسی نظام اور اس کی مختلف صورتیں اور خصوصیات، اجتماعی نظام اور اس کی بنیادیں اور اقدار، اقتصادی نظام اور اس کا فلسفہ اور مختلف شکلیں اور نظامِ حکومت اور اس کے قواعد و ضوابط سب شامل ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اسلوبِ زندگی کے اعتبار سے مستقبل اسی دین کے ہاتھ میں ہے۔ یہ اسلوبِ زندگی مربوط طور پر ان اقدار پر مشتمل ہے جو حیاتِ بشری کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرنے والی اقدار، انسان کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے والی اقدار اور انسان کی مختلف سرگرمیوں کی نگرانی کرنے والی اقدار۔

یہ دین اس اعتبار سے محض ایک وجدانی عقیدہ نہیں جس کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر بالفرض یہ بات ایک لمحہ کے لیے مان بھی لی جائے کہ کوئی دینِ الٰہی انسان کی عملی زندگی سے الگ محض وجدانی عقیدہ بھی ہو سکتا ہے تب بھی یہ بات اس دین کے بارے میں درست نہیں کہ یہ دین محض چند عبادات کا مجموعہ ہے جنہیں اس دین پر ایمان رکھنے والے انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر ادا کرتے ہیں اور اُن میں دین داری کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اور نہ یہ دین محض اخروی جنت کے حصول کے لیے آخرت کی کوئی راہ ہے، جب کہ اس دین کے منہاج اور نظاموں اور تنظیموں کے علاوہ جنتِ ارضی کے حصول کی اور بھی بہت سی راہیں ہیں۔

یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس دین کو محض وجدانی عقیدہ کی صورت میں پیش کرنے کی کوئی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، جو حیاتِ بشری کے حاضر و موجود سے بالکل الگ تھلگ ہو اور جس کا موجودہ زندگی کی تنظیمات، اس کی مختلف و متنوع صورتوں اور اس کے عملی نظاموں سے کوئی تعلق نہ ہو یا اس عقیدہ کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کے کامیاب ہونے کی کوئی اُمید نہیں جو لوگوں سے آخرت کی جنت کا وعدہ کرتا ہے، جب وہ اس کے شعائر و عبادات کو بجالائیں۔ بغیر اس کے کہ وہ سوسائٹی کے حاضر و موجود میں اس دین کے نظاموں، قوانین اور خاص حالات کو حقیقی صورت میں دیکھیں۔ یہ دین ایسا نہیں ہے نہ ایسا تھا اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے روئے زمین کا کوئی دین اپنے بارے میں اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ "دین" ہے اور اس کے ماننے والے بھی اُسے دین ہی سمجھتے ہوں مگر وہ دین، دینِ اسلام قطعاً نہیں ہو سکتا۔

ہمیں معلوم ہے کہ صدیوں سے اسلام کو وجدانی اعتقاد اور شعائرِ بندگی کے دائرے میں محدود کرنے اور عملی زندگی کے نظام میں اس کے عمل دخل کو روکنے اور حیاتِ بشری کی واقعی دوڑ دھوپ کو اس کی کامل نگرانی میں رہنے سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوششیں کی جارہی ہیں جو اسلام کی فطرت اور حقیقت کے خلاف ہیں۔

اس دین کی یہی خصوصیات ہیں یعنی جامعیت، واقعیت، قیادت جن کا عیسائیت اور صہونیت مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ اسی طرح اسلام کے ان خصائص کا۔ لہٰذا اس کے سوا کچھ چارۂ کار نہیں تھا کہ یہ دونوں مذاہب مل کر سرتوڑ کوشش کریں کہ دینِ اسلام وجدانی اعتقاد اور شعائرِ بندگی کے دائرے میں محدود و مقید ہو جائے اور موجودہ زندگی کے نظام میں دخل دینے سے باز رہے اور وہ حیاتِ بشری کی سرگرمیوں پر نگرانی سے دستکش ہو جائے۔ اسلام کو ختم کر دینے کے معرکے میں یہ کوششیں اولین اقدام کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور اتاترک کے ہاتھوں قطعی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ اس نے خلافتِ اسلامیہ کو منسوخ کیا۔ دین کو حکومت سے الگ کیا اور خالص لادینی ریاست کا اعلان کیا۔ اسلامی ممالک میں جو پہلے ہی سامراج کے زیرِ نگیں ہو چکے تھے، شریعتِ اسلامی کو قانون سازی کا واحد منبع ہونے کی حیثیت سے ہٹانے، یورپی قوانین سے استفادہ کرنے اور دینِ اسلام کو ایک محدود گوشے میں جسے شخصی قانون کے نام سے موسوم کرتے ہیں مقید کر دینے کی کئی ایک کوششیں کی گئیں۔

ان کوششوں کی کامیابی اور اتاترک کے ہاتھوں قطعی کامیابی حاصل کر لینے کے بعد اگلا قدم یا اگلا مرحلہ وہ آخری کوششیں ہیں جو اسلامی ممالک کے اطراف و اکناف

میں دینِ اسلام کی بیخ کنی کرنے، اس کو ایک عقیدہ ہونے کی حیثیت (یا مقام) سے ہٹانے اور اس کی جگہ دوسرے وضعی تصورات کو لانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ ان وضعی تصورات سے مختلف اقدار و مناہیم اور نظام نکلتے ہیں جو عقیدہ کے خلاء کو پُر کرتے ہیں اور جنہیں اُسی طرح عقیدے کا نام دیا جاتا ہے۔

ان کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ وحشیانہ ضربیں بھی ہیں جن سے رُوئے زمین پر ہر جگہ اسلامی بیداری کے علمبردار دوچار ہیں۔ ان وحشیانہ ضربیں لگانے والوں میں باہم متحارب متخاصم قوتیں شریک ہیں جو اسلامی بیداری کے بڑھتے ہوئے خوف کے سوا کسی اور بات پر ساری دُنیا میں اکٹھی نہیں ہوئیں۔ جس کا پیدا ہونا کائنات اور زندگی کے حقائق اور انسان کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر لازمی ہے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ دین اتنی بڑی حقیقت ہے اور اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ یہ ساری کوششیں اور وحشیانہ ضربیں اس سے نبٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بنی نوعِ انسان کو اس دین سے کینہ رکھنے والوں کے کینے سے اس کے تعین کردہ اسلوبِ زندگی کی زیادہ ضرورت ہے جو کہ خوفناک تیزی کے ساتھ تباہی کے گہرے گڑھے میں گر رہی ہے اور باخبر لوگ خطرے کی دُہائی دے رہے ہیں اور انسانیت کے لیے راہِ نجات تلاش کر رہے ہیں اور نجات صرف اللہ کی طرف لوٹ آنے اور اس کے دیے ہوئے صحیح اسلوبِ زندگی کو اپنا لینے میں ہے۔

پریشان اور مضطرب دل اور تھکے ہوئے گلے ہر جگہ کسی راہِ نجات اور نجات دہندہ کے لیے چیخ پکار کر رہے ہیں اور اس نجات دہندہ کی کچھ خاص نشانیاں اور خد وخال ہیں جو مطلوب ہیں اور یہ خاص علامات اور خد وخال سوائے اس دینِ اسلام کے کسی دین

پر منطبق نہیں ہوتے۔

اس دین کے عطا کردہ اسلوبِ زندگی اور بنی نوعِ انساں کے اس اسلوب کی ضرورت سے ہمیں غیر متزلزل یقین حاصل ہوتا ہے کہ مستقبل اسی دین کا ہے اور اس دُنیا میں اس کا ایک کردار جسے ادا کرنے کے لیے اُسے دعوت دی جائے گی۔ خواہ اس کے دشمن چاہیں یا نہ چاہیں اور یہ کہ یہ متوقع کردار کسی دُوسرے عقیدے یا کسی دُوسرے اسلوبِ حیات میں نہیں کہ اُسے ادا کر سکے، نیز یہ کہ ساری انسانیت زیادہ لمبے عرصہ تک اس عقیدے اور اسلوبِ حیات سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔

ہو سکتا ہے کہ انسانیت مختلف تجربوں میں بھٹکتی پھرے جیسا کہ شرق و مغرب میں یکساں طور پر اب سرگرداں ہے لیکن ہم مطمئن ہیں کہ یہ تجربات ختم ہو جائیں گے اور ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ آخر کار دینِ اسلام غالب ہو گا۔

یہ تجربات سارے کے ایک خالی دائرے میں گھوم رہے ہیں جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ دائرہ ہے بشری تصورِ حیات اور بشری تجربات کا جن میں جہل، کمزوری اور خواہشِ انسانی بھی شامل ہے اور انسانیت کو اس خالی دائرے سے نکل آنے کی ضرورت ہے اور ایک نئے اور حقیقی تجربے کا آغاز کرنے کی ضرورت ہے جو بالکل ایک مختلف اصول پر قائم ہے یعنی ربّانی اسلوبِ حیات کے اصول پر جو جہالت، نقص، کمزوری اور خواہشِ نفس کے بجائے علم، کمال، قدرت اور حکمت سے ماخوذ ہے اور اس اصول کی بنیاد یہ ہے: انسانیت کو بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی طرف لے جانا۔

اسلام کے دیئے ہوئے اسلوبِ زندگی اور اس کے علاوہ دوسرے تمام اسالیب کے

امتیازی نشان یہ ہیں کہ اسلامی نظام زندگی میں لوگ ایک ہی معبود کی بندگی کرتے ہیں اور الوہیت، ربوبیت اور حاکمیت کی صفات میں اسے منفرد سمجھتے ہیں اور صرف اسی ہی سے اپنے تصورات، اقدار، معیارات، نظامات، قوانین اور اخلاق و آداب حاصل کرتے ہیں جب کہ دوسرے سارے نظاموں میں لوگ بہت سے معبودوں اور مختلف ارباب کی بندگی کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر انہیں حاکم سمجھتے ہیں اور اپنے تصورات، اقدار، معیارات، نظام ہائے زندگی اور اس کے قوانین و اصول اور آداب و اخلاق اپنی ہی طرح کے انسانوں سے حاصل کرتے ہیں اور یوں انہیں اپنے ارباب بنا لیتے ہیں اور الوہیت، ربوبیت اور حاکمیت کے حقوق عطا کرتے ہیں حالانکہ وہ انہی کی طرح کے انسان اور انہی کی طرح کے بندے ہوتے ہیں۔

ہم ان نظاموں کو جن میں بندے بندوں کی بندگی کرتے ہیں، نظامِ جاہلیت سے منسوب کرتے ہیں۔ خواہ ان نظاموں کی کتنی ہی مختلف شکلیں ہوں اور کتنی ہی سوسائٹیوں اور زمانوں میں چلتے رہے اور چل رہے ہوں۔ یہ نظام اسی بنیاد پر قائم ہیں جسے ختم کرنے کے لیے اور جس سے انسانیت کو رہائی دلا کر زمین میں ایک ہی الوہیت قائم کرنے کے لیے دینِ اسلام آیا ہے۔ اسلام کا مقصد وحید یہ ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی میں داخل کر دے۔ بےشک یہ دین اس لیے آیا ہے کہ انسان کی عبودیت کی ہر صورت کو ختم کر کے اللہ واحد کی عبودیت کو زمین میں قائم کر دے۔ کیونکہ اس وسیع کائنات میں صرف اللہ واحدہٗ لاشریک کی عبودیت ہی ہے:

رہنما قرآن کریم

(۱) افغیر دین اللہ یبغون وله اسلم من فی السموت	کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں۔ حالانکہ سب اہل

وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○

(آل عمران : ۸۳)

آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (۳ : ۸۳)

اس دین کے سرچشمے سے پھوٹنے والا اسلوب اسلامی تاریخ کے کسی خاص دور کا تاریخی نظام نہیں ہے اور نہ یہ انسانیت کی کسی خاص نسل اور سوسائٹی کا کوئی مقامی نظام ہے بلکہ یہ تو ایک دائم اور قائم اسلوب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کی حیات کے لیے پسند فرمایا ہے تاکہ انسان کی پوری زندگی اُسی محور کے گرد گھومے جس میں اللہ کی خوشنودی ہے اور اسی معینہ نظم کے تحت جس کے تحت اللہ تعالیٰ اسے رکھنا چاہتا ہے تاکہ یہ زندگی اسی اعلیٰ ترین صورت میں رہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو غیراللہ کی بندگی سے نکال کر عزت کے مقام پر فائز کیا ہے۔

یہ اسلوبِ زندگی ایک عالمگیر حقیقت ہے جو انسانیت کے سامنے اُن کائناتی اور دائمی قوانینِ فطرت کی طرح قائم ہے جو ابتدائے آفرینش سے کائنات میں کارفرما ہیں اور آج بھی اور کل بھی رہیں گے اور بنی نوعِ انسان جن آلام و مصائب سے دوچار ہے وہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس عالمگیر حقیقت کے خلاف چلتی ہے۔

لوگ یا تو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسلوبِ زندگی کے مطابق زندگی بسر کریں یعنی وہ مسلمان ہوں یا کسی دُوسرے انسان کے اپنے بنائے ہُوئے اسلوب کے مطابق زندگی بسر کریں کہ وہ اس جاہلیت میں ہوں جس سے ہمارا دین بالکل لاتعلق ہے اور جس کی بنیاد ڈھانے اور اُسے اساسی طور پر تبدیل کر دینے اور لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ وحدہٗ کی بندگی کی طرف لے جانے کے لیے دینِ اسلام آیا تھا۔

لوگ یا تو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسلوبِ زندگی کے مطابق زندگی بسر کریں کہ وہ کائنات کے قوانینِ قدرت، فطرتِ وجود اور خود اپنی فطرت سے ہم آہنگ ہوں یا کسی دوسرے انسان کے بنائے ہوئے اسلوب کے مطابق زندگی بسر کریں کہ کائنات کے قوانینِ قدرت کے خلاف اور فطرتِ وجود اور نوامیس فطرت خود اپنی فطرت سے متصادم ہوں۔ اس تصادم کے تباہ کن نتائج زود یا بدیر ظاہر ہو کر رہیں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ لوگ اللہ اور اس کے عطا کردہ اسلوبِ زندگی کی طرف لوٹیں گے اور یہ کہ مستقبل میں بالیقین یہی دین سربلند ہو گا۔

اسی طرح ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس دین کو جسے ہر عملی اور شعوری میدان میں انسان کی واقعی زندگی کا اسلوب ہونے کی حیثیت حاصل ہے — اپنی فطرت سے ہٹانے میں صرف کی جانے والی ساری کوششیں ناکامی اور شکست سے دوچار ہوں گی۔ اس ناکامی و شکست کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں کیونکہ انسان کی زندگی اور امورِ دنیا سے علحدگی اس دین کی فطرت نہیں بلکہ یہ کسی دین کی بھی فطرت نہیں۔

ہر دین ایک ضابطہ حیات ہے

کسی دین کے اعتقادی تصور اور اجتماعی نظام کے درمیان نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے بلکہ اس گہرے تعلق سے بڑھ کر ایک چیز ناگزیر ربط ہے یعنی نظام اجتماعی کا تصور اعتقادی سے ربط۔ نظام اجتماعی اپنے جملہ خصائص کے باوصف تصورِ اعتقادی سے مشتق ہوتا ہے پھر نظام اجتماعی کا پودا اپنی اصلی اور فطری صورت میں نشوونما پاتا ہے اور تصورِ اعتقادی کائنات اس کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے انسانی وجود کی غرض و غایت کی جو تشریح پیش کرتا ہے یہ نظام اجتماعی مکمل طور پر اس کے مطابق ہو جاتا ہے۔

نظام اجتماعی کا تصور اعتقادی سے اشتقاق پھر نظام اجتماعی کا تصور اعتقادی کی پیش کردہ توضیحات و تشریحات کے مطابق ہو جانا امورِ دین و دنیا کی صحیح بلکہ واحد صورت ہے۔ کوئی اجتماعی نظام ممکن نہیں کہ فطری طور پر نشوونما پائے اور پھر صحیح طور پر قائم رہے اِلّا یہ کہ وہ کسی ایسے جامع تصور سے مشتق ہو جس میں حقیقتِ کائنات، حقیقتِ انسان اور اس کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے انسانی وجود کی غرض و غایت کے حدود متعین کیے گئے ہوں۔ ہر نظامِ اجتماعی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ وجودِ انسانی کی غرض و غایت معلوم کرے۔ انسان کو اس کائنات میں اپنے مقام کی بدولت جو حقوق حاصل ہیں وہ اس کے طرزِ عمل

کو متعین کرتے ہیں اور اُن وسائل کو متعین کرتے ہیں جنہیں وہ اپنے مقصدِ وجود کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ نیز انسان اور کائنات کے تعلق کے حدود بتاتے ہیں اور انسان اور اس کے ابنائے جنس اور اس کے مختلف اداروں کے باہمی روابط کی نوعیت کی تعیین کرتے ہیں۔ اسے ہی اجتماعی نظام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہر وہ نظام جو اس بنیاد کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہوگا۔ وہ غیر طبعی اور گمراہ کن نظام ہوگا اور اس میں اُس نظام (جس کی بنیاد کوئی جامع تصورِ اعتقادی ہو) کی طرح دیر تک زندہ رہنے کی کوئی اُمید نہیں اور اس بات کی بھی کوئی اُمید نہیں کہ اس نظام کے زیرِ سایہ انسان کی حرکت، کائنات کی حرکت، فطرتِ بشری اور انسان کی حقیقی ضروریات سے ہم آہنگ ہو سکے۔

جب یہ ہم آہنگی مفقود ہو تو پھر (اس ہم آہنگی سے عاری) نظام پر عمل پیرا ہو کر انسان بدبختی اور مصیبت سے نہیں بچ سکتے خواہ یہ نظام اُن کے لیے کتنی ہی مادی سہولتیں فراہم کرتا ہو۔ پھر فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان میں تناقض ہونے کے باعث اس نظام میں بگاڑ اور اختلال کا پیدا ہونا بھی ایک لازمی اَمر ہے۔

نظامِ اجتماعی کا تصورِ اعتقادی سے یہ اشتقاق پھر نظامِ اجتماعی کا تصورِ اعتقادی کی پیش کردہ تشریحات و توضیحات کے مطابق ہونا، تصورِ اعتقادی اور نظامِ اجتماعی کے باہمی رشتہ و ربط کا ایک سبب ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ یہ چیز آگے چل کر نہ صرف نظامِ اجتماعی بلکہ زندگی کے پُورے نظام — یعنی انسان کے افکار و احساسات، اُس کے اخلاق، عبادات اور دیگر شعائرِ بندگی اور اس زمین میں انسان کی ہر حرکت کو محیط ہو۔

اس حقیقت کو باندازِ دگر یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ہر دین ایک تصورِ اعتقادی ہونے

کے سبب نظامِ حیات بھی ہے یا اس کو زیادہ درست طور پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر دین ایک نظامِ حیات اس بنا پر ہے کہ اس میں وہ اعتقادی تصور بھی شامل ہوتا ہے جس سے کوئی اجتماعی نظام جنم لیتا ہے بلکہ وہ نظامِ زندگی جنم لیتا ہے جو اس دنیا کی زندگی میں انسان کی جملہ سرگرمیوں کو منضبط کرتا ہے۔

اسی طرح اس بات کا عکس بھی صحیح ہے کہ زندگی درحقیقت نظامِ دین ہی ہے اور کسی انسانی گروہ کا دین وہ نظامِ زندگی ہے جو اس گروہ کی زندگی کو منضبط کرتا ہے۔ اگر یہ نظامِ زندگی اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ربانی تصورِ اعتقادی سے مستنبط ہو تو اس نظام کی حامل جماعت اللہ کے دین کی پیرو سمجھی جائے گی۔ اگر یہ نظام کسی بادشاہ کا بنایا ہوا یا کسی امیر قبیلے یا قوم کا بنایا ہوا کسی بشری تصورِ مذہب اور فلسفے سے مستنبط ہو تو اس نظام کی جماعت بادشاہ کے دین یا امیر کے دین یا قبیلے کے دین پر ہوگی اور وہ اللہ کے دین میں داخل نہیں سمجھی جائے گی کیونکہ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے دین سے مستنبط نظامِ زندگی پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔

فلسفہ اجتماعیت اور اس کے مذاہب و نظریات کے ماہرین اس حقیقت کی تصریح و توضیح سے ہچکچاتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے وہ کچھ عقائد کا تعین کرتے ہیں پھر چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں اپنی زندگی میں اپنائیں اور وہ ان اجتماعی، وطنی اور قومی عقائد کو دینی عقیدہ کی جگہ دینا چاہتے ہیں۔

اشتمالیت، اشتراکیت محض ایک اجتماعی نظام کا نام نہیں بلکہ وہ ایسا اعتقادی تصور ہے جس میں کائنات کی مادی توجیہہ بطورِ اساس کے کام کرتی ہے اور اس مادیت میں متناقضات موجود ہیں جو سارے تغیرات اور انقلابات کو جنم دیتے ہیں۔ اس تصور کو جدلیاتی مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ تاریخ کی اقتصادی توجیہہ پر اور حیاتِ بشری

کے تغیرات کو آلاتِ پیداوار کے تغیر میں تبدیل کر دینے کی بنیاد پر قائم ہے۔ لہٰذا یہ محض ایک نظامِ اجتماعی نہیں بلکہ یہ تو ایک تصورِ اعتقادی ہے جس پر نظامِ اجتماعی قائم ہے یا قائم ہونے کا مدعی ہے قطع نظر اس کے کہ اصلی تصور اور موجودہ نظام کی حقیقت میں کیا فرق اور بُعد ہے (اختلاف کی خلیج کتنی وسیع ہو چکی ہے)۔

یہی صُورتِ حال اُن اسالیبِ زندگی اور اس کے موجودہ ترکیبی عناصر کی ہے جنہیں اُن کے ماننے والے "عقائد" کے نام سے پکارتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارا "اجتماعی عقیدہ" یا "ہمارا وطنی عقیدہ" یا "ہمارا قومی عقیدہ" یہ ساری تعبیرات اس حقیقت کی بالکل ٹھیک طور پر نشان دہی کرتی ہیں کہ زندگی کا ہر اسلُوب یا زندگی کا ہر نظام ہی زندگی کا "دین" ہوتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس اسلُوب یا اس نظام کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے ہیں تو اُن کا دین وہی اسلُوب یا وہی نظام ہوتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسلُوب اور نظام کے تحت زندگی بسر کریں تو وہ اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہیں اور اگر وہ کسی غیر اللہ کے وضع کردہ اسلُوب یا نظام کے تحت زندگی بسر کریں تو وہ غیر اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت اتنی بدیہی اور واضح ہے کہ ہم اس مزید بحث کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

اس سادہ سی حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو کوئی دین بھی محض وجدانی عقیدہ نہیں جو انسان کی عملی زندگی سے بالکل بے تعلق ہو، نہ وہ دین صرف چند شعائرِ عبادت کا مجموعہ ہو سکتا ہے جنہیں اس دین کے ماننے والے انفرادی یا اجتماعی طور پر ادا کریں اور نہ وہ کوئی شخصی احوال کا نام ہے جو اس دین کی شریعت کے تابع ہوں۔ جب کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر کسی دوسرے منبع و مصدر سے ماخوذ شریعت کا حکم چلتا ہو اور یہ منبع و مصدر کسی اور اسلُوبِ زندگی کی نشان دہی کرتا ہو جو دین اللہ سے مستنبط نہ ہو۔

کوئی شخص بھی لفظ "دین" کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگر وہ کسی ایسے دینِ الٰہی کے وجود کے امکان کا تصور کرے جو لوگوں کے وجدان ہی میں مقید ہو یا وہ شعائرِ عبادت یا شخصی احوال ہی تک محدود ہو اور زندگی کی ساری حرکت اور دوڑ دھوپ پر حاوی نہ ہو اور عملی زندگی پر اس کی عمل داری نہ ہو اور لوگوں کی زندگی کی زمامِ کار اس کے ہاتھ میں نہ ہو اور اُن کے تصورات، افکار، احساسات، اخلاق اور مختلف روابط میں رہنمائی نہ کرتا ہو۔

نہیں ـــ اللہ کی طرف سے ایسا کوئی دین نہیں جو صرف آخرت کی کامیابی کا ایک ذریعہ ہو اور دُنیا میں کامرانی کے حصول کے لیے انسانوں کے وضع کردہ ادیان کو اپنانے کا حکم دے۔

حقیقتِ کائنات اور حقیقتِ بشری کا یہ ایک مضحکہ خیز تصور ہے۔ اس خود ساختہ اور ایجادِ بندہ تقسیم کا مقتضا یہ ہے کہ زندگی کے ایک پہلو کی تنظیم اور نگرانی اللہ سبحانہٗ کے لیے مخصوص ہو اور دوسرے بہت سے پہلوؤں کی تنظیم اور نگرانی اللہ کے سوا دوسرے "ارباب" کے لیے مخصوص ہو۔

یہ تصور انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اتنا مضحکہ خیز کہ اس نہج پر جو لوگ سوچیں گے انہیں خود اپنے آپ پر اپنے اندازِ فکر پر ہنسی آئے گی اور وہ اپنی سادگی اور پریشان فکری پر خندہ زن ہوں گے۔ کاش وہ حقیقتِ نفس الامری کو اسلام کے دیے ہوئے صحیح زاویۂ نگاہ سے اور اس کے سکون بخش اور راہِ حیات میں راہنما نور سے دیکھتے!

انسان کی شخصیت اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے ایک "وحدت" ہے۔ ایسی وحدت کہ جو اپنے سارے وظائفِ زندگی ایک نظم کی صورت ہی میں سرانجام دیتی ہے۔ اس کے افعال اور اعمال کے درمیان ہم آہنگی قائم نہیں رہ سکتی اِلّا یہ کہ وہ بنیادی

طور پر کسی ایک ہی تصور سے مستنیر ایک ہی اسلوبِ زندگی کے تابع ہو۔

اگر انسان کا ضمیر و وجدان ایک ضابطے کے تحت ہو اور اس کی زندگی کے حقائق اور سرگرمیاں کسی دوسرے ضابطے کے تحت اور یہ دونوں ضابطے مختلف تصورات سے مستنبط ہوں۔ یعنی ایک تو انسان کے پیش کردہ تصورِ حیات سے مستنبط ہو اور دوسرا وحیِ الٰہی سے تو پھر انسان کی شخصیت فکر و عمل کے تضاد کی بیماری نفاق (Schizofrenia) میں مبتلا ہو جائے گی اور وہ انسان اپنے شعوری و وجدانی حقائق اور عملی زندگی کے حقائق میں دو عملی اور منافقت کا شکار ہو جائے گا اور وہ حیران و سرگرداں پھرے گا، جیسا کہ ہم آج امریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں اس افتراق کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں جو بچے کھچے دینی وجدان اور دینی وجدان سے بالکل بے تعلق تصورات و اقدار پر قائم ہے۔ یہ سب کچھ اس "منحوس افتراق" کے بعد ہوا جو وہاں دین اور دنیا کے مابین پیدا ہوا اور عیسائیت کی تاریخ میں اس علٰحدگی کے خاص اسباب ہیں۔

یہ "اللہ کا دین" ہی ہے جو کائنات، اس کا اپنے خالق سے تعلق، اس کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے انسانی وجود کی غرض و غایت کی مکمل اور جامع توجیہ پیش کرتا ہے۔ پھر ان روابط کی نوعیت متعین کرتا ہے جو نوعِ انسانی اس کائنات میں اپنے مرتبہ و مقام اور اس مرتبہ و مقام کی بدولت حاصل شدہ حقوق کے حدود میں رہ کر اپنے وجود کے مقصد و منشا کو حاصل کرنے کے لیے قائم کر سکتی ہے اور ان وسائل کی نوعیت متعین کرتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنے مرتبہ و مقام اور حقوق کے حدود سے نکلے بغیر اپنے مقصد کو حاصل کر سکتی ہے اور جن کے ذریعے وہ خالقِ علیم کی خوشنودی اور دنیا و آخرت کی سعادت (سعادتِ دارین) کو پا سکتی ہے۔ یہ اسی واحد اسلوبِ زندگی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے جو

نوعِ انسانی کا شیرازہ نہیں بکھیرتا اور جو اس کو فکر و عمل کے تضاد کی بیماری میں مبتلا نہیں کرتا اور جو بالآخر فطرتِ انسانی اور فطرتِ کائنات سے متصادم نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والا ہر دین انسان کے لیے اعتقادی تصور کی وہ بنیاد پیش کرتا ہے جس پر اس کی وجدانی اور عملی زندگی کا نظام قائم ہے۔ اللہ کا دین اس لیے آتا ہے کہ بنی نوعِ انسان کو اپنے رب کی طرف لوٹائے اور ان کی زندگی کے نظام کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ واحد اسلوبِ زندگی کی طرف لائے تاکہ اُن کے ضمیر اور حقائقِ زندگی، ان کے وجدان، عمل، اُن کی حرکت اور قوانینِ فطرت کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

ہر دین اللہ کی طرف سے اس لیے آتا ہے کہ وہ دُنیا میں نافذ ہو اور لوگ اپنے افعال و اعمال میں اس کی اتباع کریں نہ اس لیے کہ یہ لوگوں کے دلوں میں ایک شعور وجدانی بن کر گوشہ نشین رہے اور اُن کے اخلاق میں وہ بالیدگیِ رُوح کا سامان پیدا کرے اور اُن کے محراب و منبر میں محض شعائرِ عبادت بن کر رہ جائے اور ان کی زندگی کے صرف ایک پہلو یعنی احوالِ شخصی تک محدود ہو جائے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے وہ اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ (۴: ۶۴)

اسی طرح تورات نازل کی گئی جس میں عقیدہ اور نظامِ زندگی دونوں کے بارے میں ہدایات موجود ہیں اور اس کے ماننے والے اس بات کے پابند کیے گئے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے سارے معاملات میں اُسے حکم تسلیم کریں اور اُسے وعظ و نصیحت ہی نہ بنا ڈالیں جن کا دائرہ اُن کی رُوحانی کیفیات تک محدود ہو اور نہ شعائرِ عبادت ہی

سمجھ بیٹھیں جن کو وہ اپنے معابد میں بجالاتے ہیں:

إِنَّآ أَنزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى
وَّنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ
الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ
هَادُوا وَالرَّبّٰنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ
بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتٰبِ
اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ
فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ
وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا
قَلِيلًا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُونَ ۝ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ
فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ
وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ
بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوحَ
قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ
فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ
لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مُسلم تھے اس کے مطابق ان یہودی بن جانے والوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربّانی اور احبار بھی (اس پر فیصلے کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ پس (اے گروہ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو، جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔ تورات میں ہم نے یہودیوں کو یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ، پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (المائدہ: ۴۴-۴۵)

نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ (۵: ۴۴-۴۵)

قرآنِ مجید نے شریعتِ تورات کی یہ صرف ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ اس شریعت میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کے ذریعے موسٰی علیہ السلام اور ان کے بعد بنی اسرائیل کے دوسرے انبیا علیہم السلام صدیوں تک ان کی عملی زندگی کو منظم کرتے رہے۔

پھر عیسٰی علیہ السلام نصرانیت سے کر آئے جنہیں اللہ تعالٰی نے بنی اسرائیل کی طرف بھیجا تھا۔ وہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معمولی سے تغیرات کے ساتھ شریعتِ تورات کی تصدیق فرمائی اور یہودیوں پر سے بعض اُن بوجھوں کو اٹھا دیا جو اُن پر تادیبی سزا یا گناہ کے کفارے کے طور پر لادے گئے تھے۔ قرآن مجید نے ان کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ (الانعام: ۱۴۶)

اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے، یہ ہم نے اُن کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ (۶: ۱۴۶)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی لائی ہوئی ترمیم شدہ شریعت کو نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی

کے طور پر تسلیم کر لیا گیا:

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (المائدہ: ۴۶-۴۷)	پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسٰیؑ کو بھیجا تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا تھا اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔ (۵: ۴۶-۴۷)

پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شریعت اسلامی کے ساتھ مبعوث ہوئے اسلام اپنے سے پہلی صحیح آسمانی شریعتوں کی تردید نہیں کرتا بلکہ ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام کا پیغام تمام بنی نوع انسان کے لیے آخری پیغام ہے جو انسان کی رشد و ہدایت کا اعلان کرتا ہے اور جس میں ہر وہ بات ہے جس پر انسانی زندگی کا نظام قائم ہوتا ہے اور جن پر عمل پیرا ہو کر لوگ جاہلیت سے نکل کر اللہ کا مطیع و فرمانبردار بن جاتے ہیں اور اسلام جس طرح اپنے ماننے والوں کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا کرتا ہے اسی طرح اُن کی پوری

زندگی کو اللہ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے تابع کرتا ہے،

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ
جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً
وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ
فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ
جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاَنِ
احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ
عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اِلَيْكَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ

پھر اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب
بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں
سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس
کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس کی
محافظ و نگہبان ہے لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ
قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا
فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے
اُس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی
پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے
لیے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی ہے
اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت
بھی بنا سکتا تھا لیکن اُس نے یہ اس لیے
کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس
میں تمہاری آزمائش کرے لہٰذا بھلائیوں
میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے
کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی
طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں اصل
حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

(المائدہ: ۴۸-۵۰)

کرتے رہے ہو۔ پس اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے اُن کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؛ حالانکہ جو لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے (۵: ۴۸-۵۰)

ان بڑے بڑے مذاہب سے ہر ایک دین لوگوں کو اللہ وحدہٗ لاشریک کی ربوبیت اور اس کے بتلائے ہوئے منہاجِ زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے آیا تھا حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء اسی طریقے پر آتے رہے۔ اُن انبیاء کی شریعت تفصیلات

میں اختلاف کے باوصف اعتقادی تصور اور بنیادی مقصد میں ایک ہی تھی۔ وہ یہ ہے:
لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی طرف لے جانا اور چھوٹی
ربوبیتوں اور الوہیتوں کے طلسم کو توڑ کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی الوہیت اور ربوبیت کو
قائم کرنا۔

ایک دوسری جگہ قرآن مجید نے اجمالی طور پر اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے اور اس
واحد الٰہی اسلوبِ حیات کو واضح کیا ہے کیونکہ اللہ ہی اس کائنات اور تمام لوگوں کا خالق
ہے اور اسی کے ہاتھ میں اقتدار کی کنجیاں ہیں۔ اسی طرح اس آخری دین کے مقام کو واضح
فرما کر یہ بھی بتایا ہے کہ دوسرے تمام ادیان کا محافظ بن کر اس دین کے آنے کا سبب کیا
ہے؟ اور اس دین کے ماننے والوں اور دوسرے تمام جاہلیت پر مبنی ادیان کے ماننے
والوں میں حدِ فاصل قائم کی ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۖ يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ ۚ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ	تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے، وہی اللہ میرا رب ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے، اسی طرح جانوروں میں بھی (انہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے اور اسی طریقے سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا

الْبَصِيْرُ ○ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ شَرَعَ
لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا
وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى
وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا
الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا
فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ
مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ
اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ
يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ
مَنْ يُّنِيْبُ ○ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ
مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ

ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ
نہیں۔ وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا
ہے۔ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی
کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ جسے چاہتا ہے
کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے
نپا تلا دیتا ہے۔ اسے ہر چیز کا علم ہے۔ اس
نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا
ہے جس کا حکم اُس نے نوح کو دیا تھا اور
جسے (اے محمدؐ!) اب تمہاری طرف ہم نے
وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت
ہم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے
ہیں اسی تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس
دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی
بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے
جس کی طرف (اے محمدؐ!) تم انہیں دعوت
دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا
ہے اور اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا
ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ لوگوں
میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ

مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

(الشوریٰ ۱۴:۱۰-۱۵)

ان کے پاس علم آچکا تھا اور اسی بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے، اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے، اس لیے (اے محمدؐ!) اب تم اسی دین کی طرف دو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔

ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا
نہیں۔ اللہ ایک روز سب کو جمع کرے گا
اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے (۴۲: ۱۰۔۱۵)

قرآن مجید میں حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم اہلِ مدین کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس میں عملی زندگی کے متعلق قوانین کا ذکر اور قوم کا اُن پر اس دین کے مزاج کو نہ سمجھنے کے سبب اعتراض بھی وارد ہے جو پوری زندگی کا جامع نظام ہے۔ صرف وارداتِ قلبی اور معابد و مساجد میں ادا کیے جانے والے شعائرِ عبادت تک محدود نہیں دین کے محدود تصور میں اہلِ مدین اور دورِ جدید کی جاہلیت کے علمبردار سب برابر ہیں:

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ۝ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ

اور مدین والوں کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا اُس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا اور اے برادرانِ قوم ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ أَوْ أَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ○

(هود: ۸۴-۸۷)

پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو اور بہرحال میں تمہارے اوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے۔ (۱۱: ۸۴-۸۷)

اسی طرح قرآن مجید میں اس حقیقت کا اظہار وہاں ہوتا ہے جہاں وہ بات بیان ہوئی ہے جو صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمائی تھی:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ وَلَا تُطِيْعُوْٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ○ (الشعراء: ۱۵۰-۱۵۲)

اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور اُن حدودِ بندگی سے نکل جانے والوں کا کہا مت مانو جو زمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور کبھی اصلاح کی بات نہیں کرتے (۲۶: ۱۵۰-۱۵۲)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ تمام انبیا علیہم السلام کے فرائض اور کتابِ الٰہی کے مقصدِ عمومی کو — یعنی لوگوں میں جب اختلاف ہو تو وہ فیصلہ کن قوت ہو۔ کو متعین کرتا ہے،

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً

لوگ ایک اُمت تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ

(البقرۃ : ۲۱۳)

انبیا علیہم السلام ۔ بشارت دینے والوں اور ڈرانے والوں کو مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ حق کتاب بھی نازل فرمائی تاکہ لوگ جس معاملے میں اختلاف کرتے ہیں ۔ اس کے بارے میں اُن کے درمیان فیصلہ کرے ۔ (۲ : ۲۱۳)

کتاب الٰہی کے اور رسولوں کے فرائض کے بارے میں ساری بحث ختم ہوتی ہے اور "دین اللّٰہ" کا معنی و مطلب متعین ہوتا ہے جو اللّٰہ کے پسندیدہ نظام حیات کے مترادف ہے ۔

اس مختصر بحث میں "الدین" کی حقیقت اور اس کے حیاتِ حاضرہ کے نظام پر حاوی ہونے کے بارے میں اس سے زیادہ طویل گفتگو کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے ۔ کیونکہ دین کا بالکل کوئی معنیٰ نہیں اگر وہ اپنے خاص تصورات، خاص قوانین اور زندگی کے مختلف حقائق کی خاص توجیہات کے ذریعے حیاتِ حاضرہ کی تنظیم نہ کر سکے ۔ اس انسانی زندگی کا بنیادی نظام لازماً تصورِ اعتقادی کی اساس پر استوار ہوگا ۔ جو کائنات کی حقیقت، اس کا اپنے پیدا کرنے والے سے تعلق، اس میں انسان کے مقام و مرتبہ اور اس کے انسان ہونے کے مقصد اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے روابط کی نوعیت کی وضاحت کرتا ہے ۔ خواہ وہ روابط انسان اور رب کے درمیان ہو یا انسان اور کائنات کے درمیان یا انسان اور مجملہ مخلوقات کے درمیان یا بنی نوعِ انسان کے باہمی تعلقات ہوں ۔

اگر دین کا یہ جامع اور ہمہ گیر تصور اللہ کی طرف سے نہ ہو اور نظامِ زندگی کلی طور پر اس پر قائم نہ ہو تو پھر وہ دین نہیں بلکہ خواہشِ نفس ہے جس نے دین کا رُوپ دھار لیا ہے۔ یہ وہی جاہلیت ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ دین لوگوں کو اس سے نکالنے اور ربّانیت کی رفعتوں سے ہم کنار کرنے کے لیے آیا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ ہو تو پھر وہ انسانوں کی بندگی ہو گی اور اللہ کا یہ دین لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نجات دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس بدیہی حقیقت کے بارے میں بات کو مزید طول دینے کا کوئی جواز ہی نظر نہ آتا اگر یورپ میں وہ مناقشات پیدا نہ ہوتے جو دین اور ریاست بلکہ دین اور زندگی میں "افتراق" کا باعث ہوئے۔

اب ضروری ہے کہ ہم اُن حالات و واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں، ہماری تاریخ اور ہمارے دین کو بچائے رکھا مگر ہم نے خود حماقت سے انہیں یورپ سے درآمد کر لیا۔
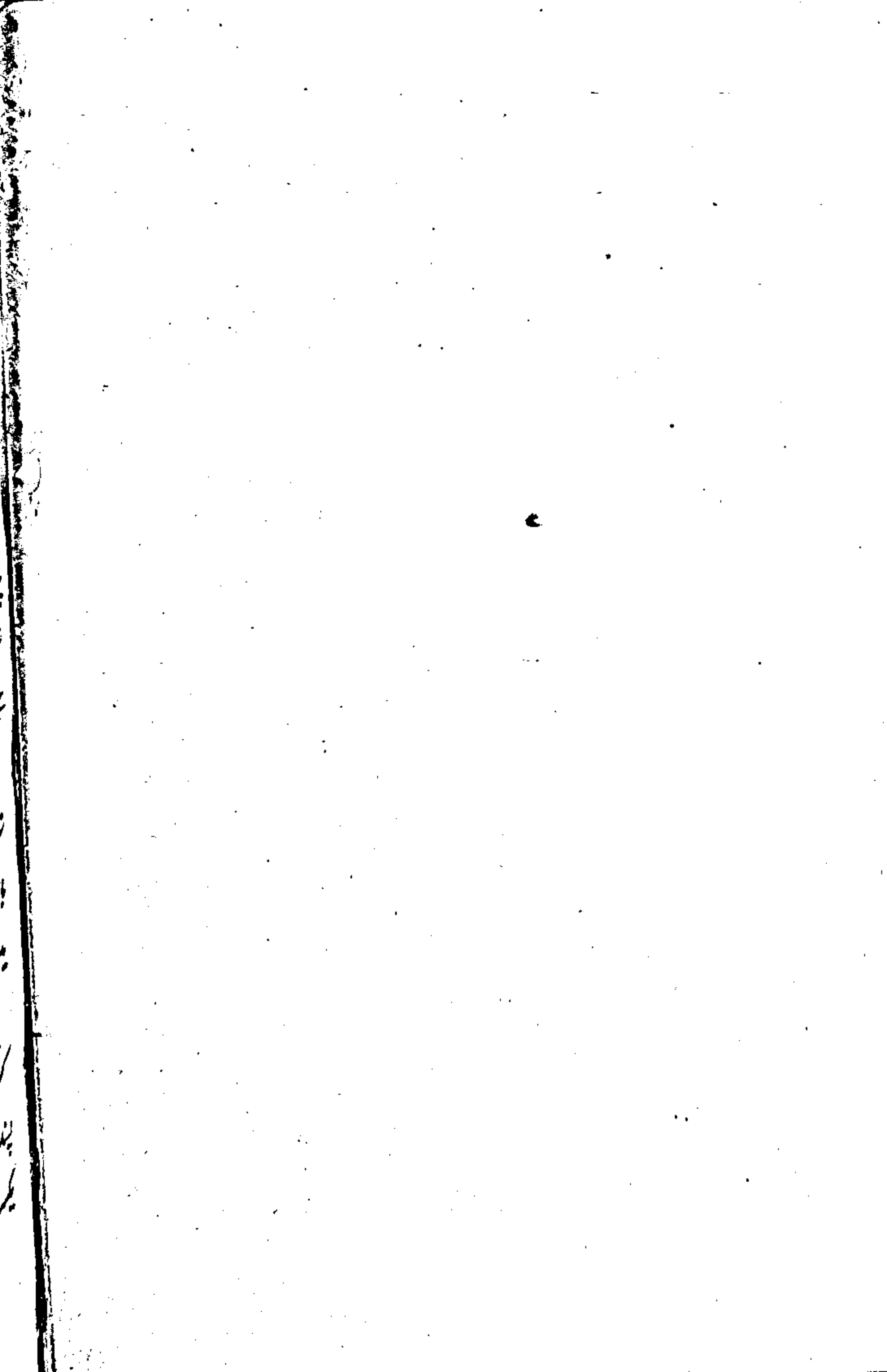
دین و دُنیا کی تفریق

دُنیا سے الگ تھلگ رہنا "الدین" کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے۔ نیز خدا پرستانہ اسلوبِ زندگی کی فطرت میں یہ بات نہیں کہ وہ وجدانی کیفیات، اخلاقیات اور شعائرِ عبادت یا حیاتِ بشری کے مختلف گوشوں میں سے صرف ایک تنگ سے گوشے جسے شخصی احوال کہا جاتا ہے تک محدود رہے۔

یہ بات بھی "الدین" کی فطرت سے بعید ہے کہ وہ باری تعالیٰ کو حیاتِ بشری کے ایک نہایت کمزور حصے کا حاکم مانے اور انسان کی عملی زندگی کے دُوسرے تمام حصوں کو معبودانِ باطل کے تابع کر دے اور باری تعالیٰ کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر خواہش نفس کی پیروی میں زندگی کے قواعد و ضوابط اور اصول و قوانین وضع کرے۔

یہ بات بھی "الدین" کے مزاج کے خلاف ہے کہ وہ دنیوی زندگی سے یکسر قطعِ نظر کر کے لوگوں کو صرف اُخروی فلاح کا راستہ بتائے جس کی انتہا جنت ہے اور لوگ اللہ کے پسندیدہ اسلوبِ زندگی کے مطابق زندگی بسر نہ کریں اور خلافتِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

"الدین" کی فطرت میں یہ بات بھی داخل نہیں کہ وہ کمزور ہو کر بازیچۂ اطفال بن

جائے یا وہ چند رسوم کا ایسا مجموعہ بن کر رہ جائے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔
اگر دین بازیچۂ اطفال بننے نہیں آیا تو پھر دنیاوی امور میں دین کی نفی کا یہ مضحکہ خیز نظریہ آخر کہاں سے آگیا ہے اور دین اور نظامِ زندگی میں یہ ناپسندیدہ افتراق کیونکر پیدا ہوا ہے۔

دین و دنیا کی یہ ناپسندید تفریق بڑے بُرے حالات میں پیدا ہوئی جس کے تباہ کن اثرات پہلے یورپ اور پھر ساری دُنیا میں رُونما ہوئے اور مغربی تصورات اور مغربی نظام ہائے زندگی کے باعث بنی نوعِ انسان ظلم وستم کا شکار ہو گئی۔
جب مخلوق کی زندگی خالق کے بنائے ہُوئے نظامِ زندگی سے بے تعلق ہو گئی تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ انسان اسی ہلاکت انگیز نظامِ زندگی کے مطابق زندگی گزارے جو انسان کا خود ساختہ تھا اور اس انجام سے ہم کنار ہو جو اس کا مقدر بن چکا تھا اور یہ کہ وہ ایک ایسے شیطانی چکر میں گھر جائے جس میں اُسے تکالیف و مصائب کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ملے اور انسان ایک دُوسرے کو ایذا پہنچانے کے درپے ہو جائے مگر وہ اس دائرے سے باہر نکلنے میں عاجز ہو اور نجات کے لیے اندر ہی اندر دہائی دیتا رہے۔
یہاں اس بدبختی کے تذکرے کا محل نہیں جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بشریت چیخ پکار کر رہی ہے، وہ آپ کو آئندہ فصلوں میں سے ملے گا۔ ہم پھر اپنے اصلی موضوع کی طرف لَوٹتے ہیں کہ وہ کون سے بُرے حالات تھے جن میں دین و دنیا کی یہ ناپسندیدہ تفریق وقوع پذیر ہوئی۔

ہر دین دنیا میں اس لیے آیا کہ وہ پُوری زندگی پر حاوی ہو۔ یہودیت آئی کہ وہ بنی اسرائیل کے لیے نظام فراہم کرے۔ اسی طرح یہودیت کے بعد نصرانیت بنی اسرائیل ہی

کے لیے ایک ترمیم شدہ نظامِ زندگی بن کر آئی۔

لیکن یہودیوں نے مسیح علیہ السلام کی رسالت کو قبول نہ کیا اور نہ اُنہوں نے اُس تخفیف و ترمیم کو قبول کیا جو مسیح علیہ السلام نصرانیت کی شکل میں اللہ کی طرف سے لائے تھے۔ حالانکہ وہ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اُن سے کہتے تھے:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○
(آل عمران: ۵۰)

اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ (۳ : ۵۰)

یہودیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور اُن کی اس دعوت کی مخالفت کی جو رُوحانی پاکیزگی اور سلامتی پر مشتمل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودی ظاہری اعمال اور مذہبی رسوم و قیود کو اہم سمجھتے تھے جن کا دل کے تقوے سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ یہودیوں نے ارضِ شام کے رومن حاکم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دے۔ قتلِ مسیح کا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا اگر اللہ تعالیٰ انہیں آسمان پر نہ اٹھا لیتا۔

اس کے بعد یہودیوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے مابین پیدا ہونے والی آویزش نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ عیسائیوں کے دلوں میں یہودیوں سے نفرت کے بیج بوئے گئے اسی طرح یہودیوں کے دلوں میں عیسائیوں کے خلاف نفرت وحقارت کی آبیاری ہوئی۔ بالآخر مسیح علیہ السلام کے پیروکار یہودیوں سے اور عیسائیت یہودیت سے الگ ہوگئی (حالانکہ عیسائیت دراصل یہودیت کی تجدید اور اس کے احکام میں معمولی ترمیم کے لیے آئی تھی۔ اگرچہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت میں روحانی احیاء اور تہذیبِ اخلاق بھی شامل تھے)۔

جب مسیحیت کے علمبرداروں اور یہودیوں کے درمیان بغض وکینہ کی یہ فضا پیدا ہوگئی تو عیسائیوں کی کتاب انجیل، تورات سے الگ ہوگئی۔ تورات اور یہودیوں کی دیگر کتب کو اگرچہ عیسائی مقدس کتابوں میں شمار کرتے تھے مگر ان کی شریعت تورات کی شریعت سے جُدا تھی۔ جب کہ سارے بنی اسرائیل (قطع نظر اس سے کہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی) کے لیے شریعت وہی تھی جو تورات میں نازل فرمائی گئی تھی۔ یوں تورات اور انجیل کے الگ الگ ہوجانے کے باعث عیسائیت کوئی مفصل دستورِ حیات (شریعت) پیش نہ کرسکی جس سے حیاتِ انسانی کو منظم کیا جاسکتا۔

مگر وہ تصورِ اعتقادی جو مسیح علیہ السلام لے کر آئے تھے اگر اپنی اصلی شکل میں رہتا تو اس بات کا پورا امکان تھا کہ کائنات، اس کائنات میں انسان کے مرتبہ ومقام اور اس کے انسانی وجود کی صحیح تشریح وتوضیح ہوسکتی جس پر نظامِ اجتماعی کو استوار کیا جاسکتا۔ اسی طرح یہ تصورِ اعتقادی، اگر اسی شکل میں رہتا جس شکل میں کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا، تو یہ اُمید کی جاسکتی تھی کہ عیسائیوں کو تورات کی شریعت اُن تبدیلیوں کے ساتھ

جو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے علمائے یہود کی خود ساختہ پابندیوں اور تکالیف میں تخفیف کے لیے شریعتِ موسوی میں کی تھیں رُنما دی جاتی۔

مگر اس کے برعکس عالمِ واقعات میں یہ ہوا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں کو یہودیوں اور رُومی بُت پرستوں (جو کہ مسیح علیہ السلام کے وطن پر حکومت کرتے تھے) کے ہاتھوں شدید مصائب اٹھانے پڑے وہ بے چارے اس بات پر مجبور ہوئے کہ دعوتِ دین کا کام چھپ کر ان ظالموں کی نظروں سے بچتے ہوئے کریں۔ انہوں نے انجیل کی بعض نصوص میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حالاتِ زندگی میں اور اس دَور کے واقعات میں جلدی جلدی تبدیلیاں کر دیں کیونکہ وہ وقت ہی ایسا تھا کہ غور و فکر اور تواترِ روایات کو ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ راویوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ انجیل کی نصوص کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حالاتِ زندگی کے ساتھ خلط ملط کر کے بیان کرنا شروع کر دیا۔ راویوں کے اختلاف کی وجہ سے انجیل کے مندرجات میں بھی اختلاف رُونما ہوا جو متعدد اناجیل کی شکل میں موجود ہے۔ ان میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے شاگردوں کے ذاتی تاثرات و خیالات اور اُن کے اپنے نقطۂ نظر سے بیان کردہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حالاتِ زندگی درج ہیں جن میں سے کچھ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے فرمودات سے ماخوذ ہیں۔ ان اناجیل میں سب سے پہلی انجیل مسیح علیہ السلام کے پوری ایک صدی بعد لکھی گئی۔ عیسائیت کے مؤرخین کے درمیان ۴۰ء سے ۶۴ء تک تاریخ کو متعین طور پر بیان کرنے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے نیز اُس زبان کے بارے میں بھی کافی اختلاف ہے جس میں کہ وہ لکھی گئی کیونکہ وہ اصلی زبان میں موجود نہیں بلکہ صرف ترجمہ دستیاب ہے۔

یورپ میں مسیحیت پولوس (سینٹ پال) کے ذریعے پہنچی۔ یہ شخص مسیحیت کا حلقہ

بگوش بننے سے پہلے بت پرست تھا۔ اُسے نہ تو حضرت مسیح علیہ السلام کی صحبت نصیب ہوئی اور نہ اس نے ان کی تعلیمات کو جاننے کی کوشش کی۔ اس نے رومی بُت پرستی اور یُونانی فلسفہ کے بہت سے غلط تصورات کو دینِ مسیح میں شامل کر کے یورپ میں اُن کا پرچار شروع کر دیا۔ یورپ میں عیسائیت کی یہ پہلی بدنصیبی تھی جو پہلے دَور مصائب کی تحریف انجیل اور حیاتِ مسیح علیہ السلام کے بارے میں بغیر غور و تدبر کے روایات نقل کرنے سے بھی بڑھ کر تھی۔

"پولس نے پہلی صدی عیسوی کے بعد کئی ایک رسائل لکھے جو دینی معتقدات اور فلسفیانہ موشگافیوں کا امتزاج تھے۔ خصوصاً فلسفہ حلول کا تو یہ شخص زبردست مبلغ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مسیح خدا کے بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے۔ بھلائی کے طلب گاروں کو اس کی عام طور پر یہ نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ کلمۃ اللہ کو اپنے اندر جذب کریں اور بخشش کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ عوام کو انبیاءؑ کی طرح بشارتیں دیتا اور کہتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب واپس آئیں گے تو وہ انہیں غیر معمولی عز و شرف سے بہرہ ور کریں گے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو "ہمارا خداوند یسوع مسیح" کہہ کر پکارتا اور اپنے آپ کو "رسولِ یسوع مسیح" کے معزز لقب سے ملقب کرتا"[1]

پولس کی دعوت جب پھیلنے لگی تو لوگ غلطی سے اسے عیسائیت کی کامیابی و کامرانی سمجھ کر خوش ہوئے، پھر جب رُومی شہنشاہ قسطنطین نے دینِ مسیح کو قبول کیا تو لوگوں نے سمجھا کہ

---

[1] "اللہ" از عباس محمود العقاد، صفحہ ۱۶۹۔

ب عیسائیت ایک حکمران طاقت بننے کی وجہ سے بڑی سُرعت کے ساتھ ترقی کرے گی۔
یک امریکی مفکر اپنی کتاب "دین اور علم" میں اسی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہُوئے لکھتا ہے:

" منافقین کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مسیحیت کے اندر شرک اور بت پرستی کے جراثیم داخل ہو گئے۔ یہ منافقین رُومی حکومت کے بڑے بلند مناصب پر فائز ہونے والے اور خطیر معاوضے پانے والے عہدے دار تھے۔ بظاہر تو یہ مسیحیت کا دم بھرتے تھے مگر ان سے اس دین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی دین سے ناواقفیت تھی اور دوسری وجہ اُن کی منافقت۔ انہیں دینِ حق کے ساتھ مخلصانہ تعلق نہ تھا۔ خود قسطنطین اس جہالت اور منافقت کا شکار تھا۔ اس کی پُوری عمر ظلم اور فسق و فجور میں گزری اور عمر کے آخری چند برسوں کے سوا اُس نے احکامِ دین کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے ڈھب کا سمجھا تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اُسے پھر بھی حاصل نہ ہوئی کہ اپنے حریف یعنی بُت پرستی کا پوری طرح استیصال کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصُول گڈمڈ ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بُت پرستی و عیسائیت دونوں کے مظاہر پہلو بہ پہلو نظر آتے تھے۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارے میں بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام نے اپنے مدِمقابل (بت پرستی) کو مطلقاً نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقائد کی بلا کسی آمیزش کے اشاعت کی۔

اس شہنشاہ کو جو محض دُنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت رکھتے تھے۔ اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بُت پرستوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت اور ارتباط پیدا کیا جائے اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمتِ عملی سے چنداں اختلاف نہیں تھا، اس لیے کہ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا، تو مذہبِ جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار بُت پرستی کی نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔"[1]

مگر یہ مذہبِ جدید بعد ازاں راسخ الاعتقاد عیسائیوں کی توقع کے خلاف بُت پرستی کی نجاستوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس میں بُت پرستانہ تصورات اور قصے کہانیاں شامل ہوتے گئے۔ پھر معاملہ کچھ اور دگرگوں ہُوا تو سیاسی اور نسلی اختلافات بھی اس میں اُبھرنے لگے اور سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے عقیدے میں ردو بدل کیا جانے لگا۔

الفرڈ بٹلر اپنی کتاب "فتح العرب لمصر" میں کہتا ہے:

" پانچویں اور چھٹی صدی مصریوں اور اہلِ روما کے درمیان مسلسل کشمکش کا دور تھا۔ اس کشمکش کی آگ کو جنس اور مذہب کے اختلاف نے بھڑکایا تھا اور مذہب کا اختلاف جنس کے اختلاف سے شدید تر تھا کیونکہ اس وقت باہمی

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۴۱-۱۴۲۔

نزاع کی سب سے بڑی وجہ بادشاہ پرستوں اور یعقوبی مذہب کے پیروکاروں[1]
کی آپس کی عداوت تھی۔ پہلا گروہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے شہنشاہی
حکومت کے مذاہب کو اختیار کرنے والا گروہ تھا جس کا یہ عقیدہ تھا کہ مسیح علیہ السلام
کئی مختلف اور متضاد صفات کے جامع ہیں۔ جب کہ دُوسرا گروہ یعنی یعقوبی مذہب
کے پیروکار ــــــ اہلِ مصر ــــ اس عقیدے کو بُرا سمجھتے تھے اور اس شدت
اور جوش سے اس عقیدے کے خلاف برسرِ پیکار ہُوئے کہ ہمارے لیے اس کا
تصور بھی بہت مشکل ہے۔"

تھامس آرنلڈ اپنی کتاب "دعوتِ اسلام" میں اس گروہی، سیاسی اور نسلی اختلاف
اور مسیحیت میں شامل کی جانے والی بدعات، اضافوں اور ترمیموں پر اس اختلاف کے
اثرات کے بارے میں کہتا ہے:

"قسطنطین اسلامی فتوحات سے ایک سو سال قبل رومی شہنشاہیت کو
وحدت کا مظہر بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر اس کی موت کے بعد جلد ہی
شیرازہ بکھر گیا اور اس بات کی اشد ضرورت ہوئی کہ کوئی ایسا مضبوط مشترکہ تصور
پیش کیا جائے جو مختلف ریاستوں اور عیسائی حکومت کے دارالحکومت کو مربوط
کر دے۔"

"جہاں تک ہرقل کا تعلق ہے اس کی کوششیں شام کو مرکزی حکومت سے
دوبارہ جوڑ دینے میں کامیاب نہ ہو سکیں مگر اس نے عام طور پر مصالحت کے لیے

---

1. Monophysites

جن طریقوں کو اختیار کیا وہ بجائے اس کے کہ اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیتے مزید تفرقہ و انتشار کا باعث ہوئے۔ اب تو صرف مذہبی احساسات ہی قومیت کے شعور کی جگہ لے سکتے تھے۔ پس ہرقل نے دینی عقائد کی ایسی تفسیر و تعبیر کی جو اطمینان بخش ہو اور مختلف متحارب گروہوں کی عداوتوں کو روک دے اور عیسائیت کے خلاف خروج کرنے والوں اور رومن کیتھولک چرچ کے درمیان اور عام عیسائیوں اور مرکزی حکومت کے مابین یگانگت پیدا کر دے۔"

"۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے یہ اعلان کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل فطرتیں جمع ہیں ایک فطرتِ الٰہی اور دوسری فطرتِ انسانی اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل برقرار رکھے ہوئے ہیں اور ایک ہی اقنوم اور جسد واحد میں جمع ہیں اور دو اقنوموں میں الگ الگ نہیں کی جا سکتیں بلکہ ایک اقنوم میں جمع ہیں۔ وہ اقنومِ واحد بیٹا بھی ہے، اللہ بھی اور روح القدس بھی۔"

"فرقہ یعقوبیہ نے اس اعلان سے شدید اختلاف کیا۔ وہ مسیح میں صرف ایک فطرت کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ وہ اقانیم کا مجموعہ ہے جس میں تمام صفاتِ الٰہی اور صفاتِ بشری موجود ہیں مگر وہ مادہ جو ان صفات کا حامل ہے اس کی دو شکلیں نہیں ہو سکتیں بلکہ وہ اقانیم کی ایک مرکب وحدت ہے۔"

"کیتھولک اور یعقوبیوں کے درمیان یہ اختلاف تقریباً دو صدیوں تک چلتا رہا۔ یعقوبی گروہ مصر و شام اور بازنطینی سلطنت کی قلمرو سے خارج علاقوں میں خوب زور پکڑ چکا تھا۔ ہرقل نے ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے یہ

نیا تصور دیا کہ مسیح ایک طرح کی مشیئت کا مالک ہے۔ یہ بات ایسے وقت
میں کہی گئی تھی جب مذہب مسیحی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں
دو نظریوں کے بقا کا تصور غالب تھا لیکن ہرقل اپنی مصالحتی کوششوں میں
اسی انجام سے دوچار ہوا جس سے بہت سے لوگ دوچار ہو چکے تھے جو مذاہب
کے ابین صلح و آشتی کے جھنڈے گاڑ دینے کی اُمید رکھتے تھے۔ ہوا یوں
کہ یہ جھگڑا نہ صرف دوسری مرتبہ تیز تر ہو گیا بلکہ خود ہرقل پر الحاد کا الزام لگایا گیا
اور وہ دونوں متخالف گروہوں کا معتوب ہو گیا۔"

یہ وہ بُرے حالات تھے جو مسیحیت کو اپنی ابتدا ہی میں پیش آئے۔ پھر دوسری مرتبہ
اپنے سیاسی غلبہ کے وقت پیش آئے اور تیسری مرتبہ اس سیاسی غلبہ کے بعد سیاسی اور
نسلی اختلافات اور عقیدۂ مسیحیت میں تحریف و ترمیم کے وقت پیش آئے۔

دونوں متخالف گروہوں کے درمیان مصالحت کرانے والوں نے مسیحیت کے تصور
اعتقادی میں ایسی عجیب و غریب چیزیں شامل کر دیں جو اس تصورِ اعتقادی کے مزاج کے
خلاف تھیں بلکہ پُورے دین الٰہی کے مزاج کے خلاف تھیں۔ اس کے بعد مسیحیت کے
تصورِ اعتقادی، جیسا کہ پیہم تحریفات اور خصوصی اور عمومی اجتماعات کے فیصلوں نے اُسے
بنا دیا تھا، میں یہ صلاحیت باقی نہ رہی تھی کہ وہ کائنات اور اس کی حقیقت، اس کائنات
کے اپنے خالق سے تعلق کی حقیقت، خالق اور اس کی صفات کی حقیقت اور وجودِ انسانی
اور اس کی غرض و غایت کی حقیقت کی الٰہی تعبیر و تفسیر پیش کر سکے۔ یہ وہ اقدار ہیں جو
لازمی طور پر درست ہونی چاہییں تاکہ اُن سے مستنبط نظام اجتماعی درست رہ سکے۔
جس پر آئندہ زندگی کا نظام قائم ہو۔

بات صرف تصورِ اعتقادی کے بگڑ جانے تک ہی محدود نہ رہی بلکہ حالات ایسا
رُخ اختیار کر گئے کہ آئندہ کئی لغزشوں اور غلطیوں کا باعث بنے۔

کلیسا نے رُومی عیش پرستی اور شہوت رانی کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی جو
سلطنتِ روما میں مسیحیت قبول کرنے سے پہلے انتہا کو پہنچ چکی تھی جس کو ڈریپر نے اپنی
کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس"[1] میں یوں بیان کیا ہے:

"جب جنگی اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنتِ روما منتہائے ترقی پر فائز ہوگئی
تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ گئی
تھی۔ اہلِ روما کی عیش پرستی اور عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ان
کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو ایک سلسلۃ العیش بنا دے۔
پاکبازی حظ نفس کے خوانِ نعمت پر بمنزلہ نمک دان ہے اور اعتدال سلسلہ
حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اُن کے دسترخوان سونے چاندی
کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے
تھے۔ ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لیے کمربستہ
کھڑے رہتے تھے، ماہ رُویانِ روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید
سے آزاد تھیں اُن کی مستی انگیز صحبتوں کا لُطف دوبالا کرنے کے لیے محوِ ناز رہتی

---

[1] فاضل مصنف نے اس کتاب کا نام "الدین والعلم" بیان کیا ہے حالانکہ اس کتاب کا
نام معرکۂ مذہب و سائنس (History of the Conflict between
Religion and Science) ہے۔

تھیں۔ عالیشان حماموں، دل کشا تماشا گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن
میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت
تک مصروفِ زور آزمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ
کے لیے خاک و خون میں سو نہ جائے۔ اہلِ روما کے سامانِ تعیش پر مزید اضافہ
ہوتا رہا۔ دُنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت
اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے۔ اس لیے کہ اسی
قوت کی بدولت اُس سرمائے کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی
مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے۔ مال اور املاک کی ضبطی،
صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص، زورِ بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے
کا نتیجہ ہے اور فرماں روائے دولتِ روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت
ہے۔ غرض روما کے نظامِ تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی
لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہدِ قدیم کی تہذیب
پر چڑھ گیا تھا۔[1]

کلیسا نے اس بے قابو شہوت رانی اور تباہی و بربادی کو روکنا چاہا مگر اس نے
کوئی فطری معتدل اور متوازن راستہ اختیار نہ کیا کرتا بھی کس طرح؟ کہ اس کے سامنے تو
مسیحیت کا وہ صحیح تصور اعتقادی ہی نہ تھا جسے صحیح اور غلط کا معیار قرار دیا جا سکتا اور فطرتِ
انسانی کے طبعی احوال میں افراط و تفریط کی نشان دہی کرتا۔

---

[1] انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اس وقت دوسری جانب "رہبانیت" کی رَو چل پڑی جو عالمِ بشریت کے لیے رومی بُت پرستی کی بہیمیت سے بھی زیادہ منحوس تھی جس نے انسان کو زندگی کی طبعی خواہشات سے محروم کر دیا۔ انسان کے فطری داعیات کو کچل ڈالا اور ان طاقتوں اور صلاحیتوں کو مٹا ڈالا جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف بقائے نسل کے لیے ودیعت فرمایا تھا تو دوسری طرف وہ اس بات کی ذمہ دار تھیں کہ زمین کو آباد کر کے اُس میں فرائضِ خلافت کو انجام دیا جا سکے۔ فطرت سے باغیانہ انحراف کمالِ تقویٰ و فضیلت کا عنوان قرار پایا۔ چونکہ یہ ایسا طرزِ عمل تھا جس کا خدا نے حکم نہیں دیا تھا، اس لیے اسے اختیار کر کے زندگی کا توازن برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

رہبانیت مذکورہ بالا تباہی و بربادی کا درماں نہ بن سکی بلکہ اس نے دونوں بے قابو فریقوں (رہبانیت کے علمبردار اور تعیش پسند اہلِ روما) کے درمیان ایک کشمکش کو جنم دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق جادۂ فطرت سے ہٹے ہوئے تھے۔

پروفیسر لیکی نے اپنی کتاب "تاریخ اخلاقِ یورپ" میں تاریخ کے اس دَور میں مسیحیت کی خوب تصویر کھینچی ہے کہ کس طرح مسیحیت، رہبانیت اور فسق و فجور کی دو انتہاؤں میں گم گئی تھی وہ کہتا ہے:

> "اخلاق میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں ارکانِ دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی۔ دُنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد و راہبین پیدا ہوئے تھے وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی

کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔[1]

اسی طرح نظامِ رہبانیت جو کہ ان کلیسائی تصورات سے ماخوذ تھا جو مسیحیت کے ربانی تصور سے ہٹے ہُوئے تھے اس بات سے عاجز رہا کہ عالمِ مسیحیت کے لیے اخلاقی نظام ہی بن سکے۔ اس نظام کی وجہ سے دلوں میں دین سے بیزاری پیدا ہو گئی۔ حالانکہ دین اس سے بری الذمہ تھا اور لوگ مذہب کے نام پر خلافِ فطرت نظام یعنی رہبانیت کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ ایک عامل تھا اُن عوامل میں سے جو آخر کار دین و دنیا کی علحدگی کا باعث ہُوئے۔

پھر ایک بہت بڑی مصیبت سے لوگ اس دن دوچار ہُوئے جب کہ انہیں معلوم ہوا کہ کلیسا انہیں لذائذِ دنیا سے محرومی کی شکل میں سزا دے رہا ہے اور انہیں اس بات کی دھمکی دے رہا ہے کہ اگر انہوں نے زندگی کی جائز اور حلال اشیا سے ذرا تمتع کیا تو ان کا جنت میں داخل ہونا مشکل ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بڑی مصیبت تو وہ تھی جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اہلِ کلیسا کی ذاتی زندگی نہ صرف یہ کہ جائز اور حلال اشیا سے فائدہ اٹھانے میں گزر رہی ہے بلکہ عیش پرستی کی حد تک گر گئی ہے اور ہر قسم کے فواحش کی نہایت گھناؤنی تصویر پیش کرتی ہے۔

ڈریپر اپنی کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" میں لکھتا ہے:

رہبانیت اور مذہب کا یہ سلبی نظام خلافِ فطرت ضرور تھا لیکن نئے مذہب کے اثرات اور اس کے رُوحانی اقتدار نے فطرت کو دبا رکھا تھا لیکن تھوڑے

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دنوں کے بعد خود مذہبی مراکز اور حلقوں میں وہ تمام عیش پرستیاں شروع ہوگئیں جن کے خلاف رہبانیت کی تحریک شروع کی گئی تھی یہاں تک کہ وہ اخلاقی انحطاط پستی اور اپنے عیش و تنعم میں خالص دنیا دار حلقوں سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے حکومت کو مجبوراً ان مذہبی دعوتوں کا سلسلہ بند کرنا پڑا جن کا بظاہر مقصد مسیحیوں میں اخوت و محبت پیدا کرنا تھا۔ اسی طرح شہداء و اولیاء کے عُرس اور اُن کی برسیاں ممنوع قرار دی گئیں کیونکہ یہ خالص مذہبی تقریبات فسق و فجور کا اڈا بن گئی تھیں۔ بڑے بڑے پادریوں پر بڑے بڑے اخلاقی جرائم کا الزام تھا۔"

سینٹ جروم (Jerume) کا کہنا ہے کہ اہلِ کلیسا کے تعیش کے سامنے اُمراء اور دولت مندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی ہے۔ خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عُہدے معمولی سامانِ تجارت کی طرح بکتے تھے اور کبھی کبھی ان کا نیلام بھی ہوتا تھا۔ جنت کے قبالے جائیداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح، مغفرت کے پروانے، نقضِ قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ بے تکلف بکتے تھے۔ مذہبی عُہدہ دار سخت مرتشی اور سُود خوار تھے۔ فضول خرچی اور اسراف کا یہ حال تھا کہ پاپائے انوسینٹ ہشتم نے پاپائی کا تاج رہن رکھا اور پاپائے لیو دہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اُڑا ڈالی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی پہلے وہ خرچ کی اس کے بعد اپنی دولت، جب یہ بھی کافی نہ ہوئی تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پہلے سے وصول کر کے صرف کر ڈالا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکتِ فرانس کی پوری

آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی۔[1]

مغفرت کے پروانے دینے کا حق جن کا ذکر پہلے ذکر کیا ہے۔ کلیسا کے مختلف اجتماعات
میں اہلِ کلیسا کو دیا جاتا تھا۔ یہ اجتماعات وقتاً فوقتاً اس لیے منعقد کیے جاتے تھے کہ اہلِ کلیسا
کی "مقدس خواہشات" کے مطابق مسیحی عقائد میں تغیر و تبدل اور حک و اضافہ کیا جا سکے۔

تاریخ کلیسا نامی کتاب میں بارھویں اجتماع کے فیصلے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"اس اجتماع نے مغفرت کے بارے میں اپنی تعلیمات کو آخری شکل دی اور کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب کلیسا کو مغفرت کے پروانے عطا کرنے کا اختیار دیا ہے اور کلیسا اس اختیار کو جو اُسے آسمان سے عطا ہوا ہے، شروع ہی سے استعمال کر رہا ہے۔ اس مقدس اجتماع نے اس بات کا اعلان کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ مسیحی قوم کو نجات دلانے کا یہ عمل کلیسا میں اہلِ کلیسا کے لیے محفوظ ہونا چاہیے۔ پھر اُن لوگوں کو جو مغفرت کے پروانوں کو غیر مفید سمجھتے تھے اور نہیں مانتے تھے کہ کلیسا کو یہ پروانے عطا کرنے کا کوئی حق ہے محروم المغفرت قرار دیا۔ اگرچہ یہ مقدس اجتماع یہ چاہتا تھا کہ اس اختیار کو سابقہ روایات کے مطابق احتیاط اور دانشمندی سے استعمال کیا جائے اور کلیسا کے اندر ہی قائم رہے تاکہ کلیسائی تہذیب میں تساہل کے سبب کوئی ڈھیل پیدا نہ ہو جائے۔"

مغفرت کے وہ پروانے جو سرِ عام بکتے تھے اُن کا متن یوں ہوا کرتا تھا:

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن ندوی صفحہ: ۲۴۹، ۲۵۰

"ہمارا رب یسوع تجھ پر رحم فرمائے (اے فلاں!) اور اس نے جو دکھ اٹھائے ہیں اس کے بدلے میں تمہاری مغفرت فرمائے۔ میں اس کے بااختیار نائب ہونے کی حیثیت سے تمہاری تمام تقصیریں معاف کرتا ہوں۔ کلیسا کے سلسلے میں تجھ سے جو چھوٹی بڑی کوتاہیاں، گناہ اور فروگذاشتیں ہوئی ہیں ان سب کو کالعدم قرار دیتا ہوں اور ہر گناہ جو تو نے پوپ اعظم یا اس کے نائب کے خلاف بھی کیا ہے انہیں بھی ساقط کرتا ہوں۔ الغرض ہر طرح کی خطا اور قابلِ ملامت فعل جو تو نے آج تک کیا ہے اسے معاف کرتا ہوں۔ جامطہر اور پاکیزہ زندگی اختیار کرنے میں تم سے جو لغزشیں سرزد ہوئی ہیں ان سب پر خطِ تنسیخ پھیرتا ہوں۔ تجھے پھر سے کلیسا کے حلقے اور مقدس افراد کے زمرے میں شامل کرتا ہوں۔ تمہارے سر پر نیکی اور طہارت کا تاج پہناتا ہوں۔ اب تمہاری وفات کے بعد تمہارے لیے وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا جس سے داخل ہو کر خطاکار مقامِ عذاب پر پہنچتے ہیں اور وہ دروازہ کھول دیا جائے گا جو جنت کو جاتا ہے۔ اگر تمہیں عرصہ دراز تک بھی موت نہ آئے تو اس پروانۂ مغفرت کی نعمت تمہارے پاس جگوں کی جگوں قائم رہے گی۔ یہاں تک کہ تم اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دو۔ باپ بیٹا اور روح القدس کے نام سے۔"

اگر ہم اس بات کو کہ اہلِ کلیسا کس طرح دین کے نام پر انسانوں کو اُن کے جائز مالوں سے محروم کرتے تھے حالانکہ دین ایسی عیاریوں سے مبرا ہے، اہلِ کلیسا کی عیش پرستی بدقماشی اور مغفرت کے پروانوں کی بیہودگی پر غور کیا جائے تو ان اندوہناک حالات کا

کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے جو یورپ میں دین و دنیا کی تفریق کا باعث ہُوئے۔
معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا بلکہ اہلِ کلیسا اور بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کے
درمیان ایک طویل اور شدید چپقلش شروع ہو گئی جس کی بُنیاد دین و اخلاق کے بجائے
ذاتی اقتدار کی ہوس تھی؛

" گیارھویں صدی عیسوی میں حکومت و کلیسا کی کشمکش شروع ہوئی
اور اُس نے بڑی شدت اختیار کر لی۔ ابتدا میں پوپ کو اس جنگ میں
فتح ہوئی اور پوپ کا اقتدار و اعزاز اتنا بڑھ گیا کہ شہنشاہ ہنری چہارم ۱۰۷۷ء
میں اس بات پر مجبور ہوا کہ کانوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو۔
چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا۔ پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں
کی سفارش پر اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے
پاؤں اُون پہنے ہُوئے آیا۔ پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے اس
کی غلطی معاف کی۔ اس کے بعد حکومت و کلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کو
فتح اور کبھی شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ آخر کار حکومت کے مقابلہ میں کلیسا
کو دبنا پڑا۔"[1]

" سوسنہ سلیمان کی کتاب میں لکھا ہے کہ ۱۲۴۵ء میں یہ ہوا کہ پوپ انوسنٹ
چہارم کے حکم سے شاہ فرانس فریڈرک کو اقتدار سے معزول و محروم کرنے کے
لیے فرانس میں لیون کے مقام پر تیرھواں اجتماع منعقد ہُوا لیکن کلیسا نے

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۰۲۔

فرانس نے اس اجماع کے فیصلے کو تسلیم کرنے اور اس کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔[1]"

جب کلیسا نے بادشاہوں اور امراء سے اقتدار کی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ عوام پر تسلط کا حق اپنے لیے محفوظ کر رکھا تھا اور لوگوں پر بھاری مالی تاوان عائد کرتے میں اپنے اس حق تسلط کو بدترین طریقے سے استعمال بھی کیا۔ (یہ تاوان کلیسا کو براہِ راست وصول ہوتے تھے) لوگ اس ظلم و ستم سے تنگ آ گئے۔ ادھر کلیسا کے مخالف حکام نے ان مظالم کی آڑ لے کر لوگوں کو کلیسا کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا۔ سب سے پہلے دینی طبقے کو رُسوا کیا گیا۔ ان کی بدکاریوں اور بداعمالیوں کو بے نقاب کیا گیا اور اُن کی ذاتی زندگیوں کے اُن گوشوں سے پردہ اُٹھایا گیا جو ان کے مذہبی لباس اور کلیسا کے رسم و رواج کے ظاہری وقار کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔

وہ مہلک جُرم جو یورپ میں دین و دُنیا کے درمیان تفریق کا باعث ہوا اور جو بالآخر تصورِ اعتقادی اور نظامِ اجتماعی کے درمیان انقلاح کا ایک سبب بنا بلکہ وہ جرم عظیم جو مغربی کلیسا سے خود اپنے خلاف، دینِ مسیحیت کے خلاف بلکہ جب تک اللہ تعالیٰ حالات نہ بدل دے، رُوئے زمین کے سارے ادیان کے خلاف سرزد ہوا یہ ہے:

کلیسا نے "کتابِ مقدس" کو سمجھنے اور اس کی تشریح و تفسیر کرنے کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا اور کسی غیر پادری کے لیے اس بات کی ممانعت کر دی گئی کہ وہ کتاب مقدس کو سمجھنے یا اس کی تفسیر کرنے کی کوشش کرے۔

---

[1] محاضرات فی النصرانیہ : محمد ابوزہرہ

پھر اس کے بعد اہلِ کلیسا نے عقیدۂ مسیحیت میں کچھ ایسی باتیں داخل کر دیں کہ وہ ایک چیستان بن گیا جسے سمجھنا اور اس کی تصدیق کرنا عوام کے لیے ممکن نہ تھا۔ گزشتہ صفحات میں جہاں ہم نے حقیقتِ مسیح کے بارے میں "تھامس آرنلڈ" کے حوالے سے کچھ نقل کیا ہے اس چیستان کی ایک مثال بیان کر چکے ہیں۔

پھر اہلِ کلیسا نے عبادت کے طور طریقوں میں بھی کچھ ایسی باتیں داخل کر دیں جو عام لوگوں کے فہم و ادراک سے بالاتر تھیں۔ جن کی نمایاں مثال "عشائے ربانی" کا مسئلہ ہے جو دینِ مسیحیت میں اُن بدعات میں سے ایک تھا جن کے خلاف مارٹن لوتھر وغیرہ مصلحِ دین کی تحریک لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

عشائے ربانی یا طعامِ ربانی کا مسئلہ بالکل نیا مسئلہ تھا جس کا ذکر کتابِ مقدس میں بھی نہیں آیا اور جس کو اوّلین مسیحیوں اور "پہلی مقدس مجلسوں" نے بھی نہیں چھیڑا۔ یہ قصہ یوں ہے :

مسیحی ایسٹر کے دن روٹی کھاتے اور شراب پیتے ہیں اور اس خورد و نوش کو طعامِ ربانی سے موسوم کرتے ہیں۔

اہلِ کلیسا کا گمان تھا کہ یہ روٹی مسیح علیہ السلام کے جسم میں اور یہ شراب اُن کے خون میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جو شخص بھی یہ روٹی کھائے اور شراب پیے اس کے جسم میں مسیح علیہ السلام اپنے گوشت اور خون کے ساتھ منتقل ہو جاتے ہیں اور کلیسا نے لوگوں کے لیے اس زعم باطل کو بلا چوں و چرا قبول کرنے کو واجب قرار دے دیا۔ ورنہ انہیں مسیحیت سے خارج اور مغفرتِ الٰہی سے محروم قرار دیا۔

اہلِ کلیسا نے اس قسم کی خرافات اور معموں کو عقائد اور عبادات میں شامل کرنے

پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ لوگوں کو اس بات سے بھی روک دیا کہ وہ کتاب مقدس میں ان خرافات کی کوئی اصولی بنیاد تلاش کر کے اس کو سمجھنے اور اس کی تشریح و تفسیر کرنے کی کوشش کریں بلکہ اُن کے بعد کائنات اور زندگی کے بارے میں ایسی ہی بہت سی خرافات کا ظہور بھی اُس سے ہُوا۔ اُس نے کائنات، زندگی اور انسان کے متعلق بعض جغرافیائی، تاریخی اور طبعی آراء نظریات کا دعویٰ کیا جو خطا و خرافات کا پلندہ تھے اور خود ساختہ نظریات کو مقدس احکام کا درجہ دے دیا جن پر بحث کرنا یا جن کی تصحیح کرنا یا انہیں تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنا یا اُن کے متعلق کوئی بات کرنا بالکل ناجائز قرار دیا گیا۔

دین کے لیے یہ ایک حادثہ یا المیہ تھا کہ اس میں اہلِ کلیسا کی حماقت سے وہ غلط نظریات شامل کر دیے گئے جن کی غلطی اور جن کا کھوٹا پن تجربے سے بآسانی واضح ہو جاتا تھا کیونکہ کائناتی علوم ایک ایسا شعبۂ زندگی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانی عقل کو تحقیق و تفحص کی مکمل آزادی دے رکھی ہے اور انسانی عقل تحقیق و تفحص کی پُوری صلاحیتیں رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان علوم کے بارے میں مذہب کو کوئی لگا بندھا نظریہ عطا نہیں کیا۔

اس مقام پر ہم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گراں مایہ تصنیف "انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کلیسا کی اس احمقانہ روش نے دین و دُنیا کی تفریق میں کیا کردار ادا کیا:

"اہلِ دین کی سب سے خطرناک غلطی جس سے انہوں نے اس مذہب کو جس کے وہ نمائندے تھے اور خود اپنے کو سخت ترین نقصان پہنچایا یہ تھی کہ انہوں نے اپنی مقدس دینی کتابوں میں ان تاریخی، جغرافیائی اور طبعی

نظریات اور مشورات کو داخل کردیا جو اس زمانے کی تحقیقات اور مسلمات تھے اور انسانی علم ان کے زمانہ تک اسی حد تک پہنچا تھا لیکن وہ انسانی علم کی حد نہ تھی اور اگر اس زمانہ میں وہ حد سمجھ لی گئی تھی تو وہ دراصل آخری حد نہ تھی اس لیے کہ انسان کا علم تدریجی، ترقی پذیر اور مسافر ہے جس کا قیام عارضی ہے اس پر کوئی پائیدار عمارت قائم نہیں کی جا سکتی۔ وہ بعض اوقات ریت کی طرح کھسک جاتا ہے اور عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ ارباب کلیسا نے غالباً خوش نیتی سے ایسا کیا تھا۔ ان کا مقصد شاید یہ تھا کہ اس سے ان آسمانی کتابوں کی عظمت و شان اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا لیکن آگے چل کر یہی چیز ان کے لیے وبالِ جان اور مذہب و عقلیت کے اس نامبارک معرکے کا سبب ہوئی۔ جس میں مذہب (وہ مذہب جس میں انسانی علم کی آمیزش تھی) نے شکست کھائی اور یورپ میں اہلِ مذہب کو ایسا زوال آیا جس کے بعد پھر عروج نہ ہو سکا۔ اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ یورپ لادینی ہو گیا۔

اہلِ مذہب نے صرف اسی الحاق اور تحریف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام جغرافیائی، تاریخی اور طبعی معلومات کو جو لوگوں میں زبان زد اور مشہور تھیں یا کتب مقدسہ کے بعض شارحین اور مفسرین نے ان کا تذکرہ کیا تھا۔ دینی تقدس کا جامہ پہنایا اور ان کو مذہبی رنگ دے کر ان مسیحی تعلیمات و اصول میں شامل کر لیا جن پر اعتقاد رکھنا ایک مسیحی کے لیے ضروری ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کتابیں تصنیف کیں اور اس جغرافیہ کو جس کی کوئی آسمانی سند نہ تھی جغرافیہ مسیحی (Christian Geography) کا نام دیا اور اس کے تسلیم کرنے پر

اس قدر اصرار کیا کہ جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اُن کی تکفیر کی۔

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں عقلیت کا کوہِ آتش فشاں پھٹ چکا تھا۔ علمائے طبیعیات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے۔ انہوں نے ان بے اصل نظریات کی تردید کی جو جغرافیہ، تاریخ اور طبیعیات سے متعلق ان مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے اور بڑی جسارت اور آزادی کے ساتھ ان کی علمی تنقید کی اور بے سمجھے ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے علمی اکتشافات اور تجربوں کا بھی اعلان کر دیا، اب کیا تھا مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہو گئی۔ ارباب کلیسا نے (جو اقتدار اور طاقت کے مالک تھے) اُن کی تکفیر کی اور دین مسیحی کے لیے ان کے خون بہانے اور ان کے مال و متاع ضبط کر لینے کی اجازت دی۔ احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جو بقول پوپ کے "ان ملاحدہ اور مرتدین کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں" ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا۔ حتیٰ کہ ان عدالتوں کی کوششوں کی وجہ سے مسیحی دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا باقی نہ رہا جو کلیسا کے ساختہ پرداختہ معتقدات سے اختلاف رکھتا ہو۔ ان عدالتوں نے برِاعظم یورپ کے طول و عرض میں جاسوس پھیلا دیے جنہوں نے لوگوں کے معتقدات کا کھوج لگانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ایک عیسائی عالم کہتا ہے "ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے"

"اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزادی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں۔ جن میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہیں زندہ جلانے والوں میں سے ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو (Bruno) بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ محکمہ احتساب کے حکام نے اُسے قتل کر دینے کا حکم دیا اور اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ اُسے نہایت نرمی سے سزادی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو (Galileo) کو بھی اسی بنا پر موت کی سزادی گئی کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا

آخر کار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے مذہب و قدامت پرستی کے نمائندوں کے خلاف علم جنگ بلند کر دیا۔ وہ مذہبی گروہ کے اس تشدد و جمود اور محکمۂ احتساب کے ان مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان کو ان تمام عقائد، علم اور اخلاق و آداب سے نفرت ہو گئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی تھی یا اس سے اُن کا تعلق ثابت ہوتا تھا۔ ان کے دل میں ابتداءً مسیحی مذہب کے خلاف اور رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف عداوت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ جنگ جو ابتداءً علوم و عقلیت کے علمبردار اور مسیحی مذہب (درحقیقت سینٹ پال کے مذہب) کے نمائندوں کے درمیان تھی بعد میں علم و دین کی باہمی جنگ کی صورت اس نے اختیار کر لی۔ روشن خیالی

اور عقلیت کے علمبرداروں نے بطور خود یہ طے کر لیا کہ علم و مذہب ایک دوسرے کی ضد اور مقابل واقع ہوئے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے اور دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے علم و عقلیت کی وفاداری کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذہب سے منہ موڑ لیا جائے۔ ان کے سامنے جب دین و مذہب کا نام آتا تو دفعتاً نمائندگانِ مذہب اور اربابِ کلیسا کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور ان بے گناہ علماء اور محققین کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنہوں نے انتہائی مظلومیت اور بے بسی کی حالت میں ان جلادوں کے ہاتھوں پُر اذیت موت پائی۔ مذہبی گروہ کے نام سے اُن کی نگاہوں کے سامنے پُر غضب چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، شرر فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور عقل سے خالی دماغ ہی آتے تھے۔ چنانچہ مذہب سے وحشت و نفرت کو انہوں نے ایک اصولِ زندگی کے طور پر طے کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نفرت و کراہت کا ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

ان روشن خیالوں اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر و سکون، مطالعہ اور غور کی قوت اور عقل اور اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک اربابِ کلیسا کا جمود، جہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بے تعلقی اختیار کر لینا کہاں تک حق بجانب ہے لیکن غصہ اور اہلِ مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ

میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسے کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے۔ انہوں کے دین کے ساتھ کہیں بھی اور کبھی بھی کوئی رواداری اور مفاہمت پسند نہیں کی[1]

یہ ہیں نہایت مختصر طور پر وہ اہم ترین حالات و واقعات جو دین اور دنیا کی تفریق کا باعث ہوئے جس کے بڑے مصیبت انگیز اثرات یورپ کو اور اس کے ساتھ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج پوری انسانیت کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔

یہ تھا وہ دین جس کے خلاف سارے یورپ نے بغاوت کر دی تھی پھر تمام رُوئے زمین کے لوگوں نے طوطوں اور بندروں کی طرح اس بغاوت میں بلا تفریق مذہب و ملت یورپ کی تقلید کی۔

یہ تھا وہ دین جس کے خلاف سارا یورپ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ دین کہ جس کے رہنما اصولوں کو پہلے قدم پر ہی بگاڑ کا نشانہ بنایا گیا۔ پھر اس کے خصائصِ ربانی، تصورات آسمانی اور اس کی اقدار اور اساس میں باطل کی آمیزش کی گئی۔ یہ جعل سازی کی بدترین صورت تھی۔

یہ تھے وہ علمبرداران مذہب جنہوں نے اُس مذہب کی قیادت سنبھال کر اپنے آپ پر مذہب پر اور تمام بدنصیب انسانیت کے خلاف یہ جرم (تفریق دین و دُنیا) کیا تھا جہاں باطل کی آمیزش والے دین اور جعل ساز اہلِ مذہب کی وجہ سے ایک تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ یہ سارے حالات صرف یورپ کے ساتھ مختص ہیں۔ ان کی حیثیت عالمگیر نہیں۔ اور یہ دین کی ایک خاص قسم سے متعلق ہیں۔ دین کی حقیقت سے

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۲۵۴ تا ۲۵۰

ان کا کوئی تعلق نہیں اور ان کا وقوع پذیر ہونا تاریخ کے ایک خاص دور سے مختص ہے۔
انسانیت ان حالات کے رُوح فرسا اثرات سے نجات پا سکتی ہے اگر وہ تاریکی معرکہ کے دھوئیں کے بادلوں کے پیچھے سے حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔
مگر یہ نجات مغربی عقلیت کے ذریعے سے ہرگز نہیں پائی جا سکتی۔ یہ نجات اس عقلیت سے ہرگز نہیں پھُوٹ سکتی جو تلخ تاریخ اور دین و دنیا کی آویزش کے چھوڑے ہُوئے اثرات، فکر و ضمیر، فن و ادب اور سیاست و معیشت اور زندگی کے ہر شعبے میں چلنے والی مختلف لہروں کی زَد میں ہو اور جو بالآخر خاکِ مغرب میں اپنی جڑیں مضبوط کر لینے کے بعد دین و دنیا کی اس منحوس تفریق کا باعث ہوئی ہو۔

سفید فام انسان کے دورِ حکمرانی کی انتہا

عصرِ حاضر کے مشہور انگریز فلسفی برٹرینڈرسل نے کہا ہے :

" سفید فام انسان کا دورِ اقتدار بیت چکا ہے۔ کیوں نہ ہو اس کی قیادت و سیادت کا ابد تک قائم رہنا کوئی قانونِ فطرت تو نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ سفید فام آدمی کو قدرت نے گزشتہ چار صدیوں میں جو زریں مواقع فراہم کیے تھے اب دوبارہ اُسے کبھی میسر نہ آئیں گے۔ بے شک اب رُوسی وہ واحد سفید فام انسان ہے جسے ایشیا میں اپنے اثر و نفوذ کو پھیلانے کا موقع میسر ہے۔ ایشیائی قومیں سرمایہ دارانہ استعمار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں مگر انہیں معلوم نہیں کہ رُوس کے بھی کچھ استعماری مقاصد ہیں۔ انہوں نے روس کو بالکل نہیں آزمایا۔ وُہ صدیوں تک مغربی اقتدار کے ماتحت رہی ہیں اور اس سے نفرت کرنے لگی ہیں۔ ایشیائی قوموں کے مغربی استعمار سے اس تنفر کے باعث مجھے بالکل یقین ہے کہ مغربی ممالک کے لیے ایشیائی مُلکوں میں اب اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کا کوئی موقع نہیں ہے مگر مجھے اس بات کی پُوری توقع ہے کہ ہندوستان مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک کے ساتھ

پورا ربط و ضبط رکھے گا اور عرب ممالک، مصر اور پاکستان اشتراکیت کی آغوش میں چلے جائیں گے۔"

برٹرینڈرسل نے یہ پیش گوئی ۱۹۵۰ء میں کی تھی جسے بعد کے واقعات۔ خاص کر چین کے اشتراکیت کی آغوش میں جاگرنے نے سچا ثابت کر دکھایا۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کی یہ پیش گوئی کوتاہ نظری اور مادی اسباب کے بالکل سطحی تجربہ پر مبنی ہے۔ ہم اس کو ایک صحیح اور بالغ نظر مفکر کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتے خواہ اس کی حریت فکر کا کتنا ہی شہرہ کیوں نہ ہو کیونکہ وہ عقلیت، اپنے خاص ماحول، موروثی خصوصیات اور خاص تہذیب میں گھرا ہوا ہے جس سے باہر وہ سوچ ہی نہیں سکتا اور اپنے مادی ماحول سے آزاد ہو کر پوری دنیا کے حالات کا نئے زاویوں سے جائزہ لے کر رائے قائم کر ہی نہیں سکتا۔

یہ مسئلہ جس پر موصوف نے اظہارِ خیال کیا ہے گہری توجہ کا محتاج ہے۔ سفید فام انسان کا دَور بیت چکا ہے کیونکہ اس کی تہذیب کے محدود مقاصد پورے ہو گئے ہیں اور اس کے پاس تصورات، اصول اور اقدار کا جو سرمایہ تھا اس میں سے کوئی چیز بھی ایسی باقی نہیں رہی جو وہ انسانیت کو دے سکے اور نسل انسانی، اقدارِ انسانی اور حیاتِ انسانی کو بہتر اور کامیاب بنا سکے۔

سفید فام انسان کی تہذیب انگلستان کے میگنا کارٹا اور انقلاب فرانس کے اصولوں اور "امریکی تجربہ" میں کارفرما آزادئ فرد کے اصولوں میں بانجھ پن پیدا کرنے کے بعد خود بانجھ ہو گئی ہے یا ہونے کے قریب ہے۔

یہ سب کچھ محدود اقدار تھیں جو ایک خاص دَور میں رائج رہیں اور مخصوص حالات سے دوچار ہوئیں اور بنی نوعِ انسان کے لیے اقدار کا کوئی ایسا سرمدی چشمہ نہ ثابت ہو سکیں

جن سے مدتِ دراز تک کام لیا جا سکے۔

اس تہذیب کی ساری اقدار اُس اصل الاصول سے بالکل منقطع تھیں جس کو بنیاد بنائے بغیر کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں رہ سکتا اور کوئی اصول و اقدار زندہ نہیں رہ سکتیں یعنی وہ اصولِ اعتقادی کہ جس کا تعلق ذات خداوندی سے ہے اور جس میں کائنات، اس میں انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے وجود کے مقصد و منتہا کی مکمل تفسیر و تشریح موجود ہے۔ لہٰذا مغربی تہذیب کی محدود اور وقتی اقدار جو دراصل خالقِ کائنات سے بے تعلق ہیں ایک شیطانی پودے کی مانند ہیں جس کی جڑیں فطرتِ بشری کی گہرائیوں میں نہیں کیونکہ یہ اس سرچشمے سے نہیں پھوٹیں جس سے فطرتِ انسانی معرضِ وجود میں آئی ہے۔

چونکہ سفید فام انسان کی تہذیب کے اصول و مبادی خدا کے عطا کردہ اصل الاصول سے ماخوذ نہیں اور سرمدی سرچشمے سے حاصل نہیں کیے گئے اس لیے وہ ایک ایسی بنیاد پر استوار ہوئے جو فطرتِ حیات اور فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ نیز اس تہذیب نے اپنی بنیاد، وسائل اور طریقِ کار میں انسان کی اُن حقیقی ضرورت کا لحاظ نہیں رکھا جو اس کی تکوین کے مزاج، اس کی تخلیق کی اصلیت اور اس کی فطرت کی حقیقت کا تقاضا ہیں اور اُن انسانی اقدار کو نظر انداز کیا گیا جو انسان کو انسان بناتی ہیں نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ انہیں بڑی حقارت کے ساتھ مُسترد کر دیا گیا۔

یہ سب کچھ اُن بدترین حالات کے باعث ہوا جنھوں نے دین و دُنیا کی تفریق کو جنم دیا اور جن میں یہ تہذیب مخالفِ دین بنیادوں پر قائم ہوئی یعنی فکری، شعوری اور جذباتی بنیادوں پر اور اس وقت سے اس تہذیب نے وہ راہ اختیار کی جو انسانیت

کی حقیقت، بنی نوعِ انسان کی حقیقی ضروریات اور اُن صحیح اقدار کے منافی ہے جن سے انسانی زندگی کو سرفراز ہونا چاہیے۔

جس دن سے انسان نے اس تہذیب کو اپنایا ہے اسی دن سے وہ بدبختی کا شکار چلا آرہا ہے۔ حالانکہ یہ تہذیب انسان کی خدمت، ترقی اور خوش بختی کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھی اور جب "انسان" اور "تہذیب" ایک دوسرے کی ضد ہوجائیں تو پھر انسان کی اپنی تہذیب کے ساتھ کشمکش شروع ہوجاتی ہے اور مصائب و آلام، نقصانات اور تلخیوں کا ایک دَور آتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہی عرصہ قائم رہے یا زیادہ۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تہذیب پر غالب آجاتا ہے کیونکہ وہی کسی تہذیب کی اصل بنیاد ہوتا ہے اور اس کی فطرت اس سے بہت گہری اور پائیدار ہے کہ کوئی وقتی تہذیب اس پر اپنے نقوش ثبت کرسکے۔

جب کبھی کسی تہذیب کے بقا کا معیار انسانی فطرت قرار پاتی ہے تو رُوسی، انگریز، امریکی، فرانسیسی اور دیگر تمام سفید فام انسان ایک دوسرے کے ساتھ ہم رکاب نظر آتے ہیں بلکہ رُوسی تو اپنے اس بے تُکے نظام کے سبب بہت پیچھے دکھائی دیتا ہے جس کو اپنی بقاء کے لیے اپنے جزئیات اور کلیات میں انسانی فطرت سے شدید تصادم کی وجہ سے پولیس کے ظلم و استبداد، عوام کے کشت و خُون، تطہیر کے نام پر ہلاکت خیزیوں اور جبری کیمپوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

مارکسیت کو اگر ایک نظریے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے علمبردار زمان و مکان کی حقیقت کو تو کیا سمجھیں گے نفسِ انسانی اس کے مزاج اور اس کی تاریخ سے بالکل نابلد ہیں۔ اس کا سارا فلسفہ اس بنیادی تصوّر کے گرد گھومتا ہے کہ انسانی افکار و اعمال

کا سب سے بڑا محرک بھوک اور روٹی کے ایک لقمے پر باہمی آویزش ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ کے سارے انقلابات صرف ذرائع پیداوار میں تغیر کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ اس انداز فکر نے انسان کے سارے امتیازی خصائص کو کالعدم قرار دیا ہے جو تاریخ بشری اور تاریخ حیوانیات کے درمیان وجۂ امتیاز ہیں۔ اس نے انسان کے ان اعمال کو بھی بے وزن بنا دیا ہے جن کی رُو سے وہ تاریخی ارتقار کے مختلف مراحل میں ایک فیصلہ کن عامل رہا ہے۔ اس نے انسان کے مستقبل کو ماضی کے تجربات کے بیش قیمت سرمائے سے یکسر محروم کر دیا ہے۔ اس کے مطابق انسان اس طبقاتی آویزش کے نتیجے میں خود بخود فرشتے بن جائیں گے، اپنے فرائض خود بخود ادا کرنے لگیں گے اور اپنی محنت کے ثمرات میں سے صرف اتنا حصہ لینے پر قناعت کریں گے جو ان کی کفالت کر سکے اور یہ طرز عمل کسی خارجی دباؤ کے بغیر، کسی حکومت کے استبداد کے بغیر اور کسی جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف کے بغیر اختیار کریں گے۔ ہمیں تو انسانی فکر و عمل کے بارے میں یہ خوش کن توقعات بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ ساری تبدیلیاں سرمایہ دارانہ عناصر کو برباد کرنے اور مزدوروں کی قیادت و سیادت قائم کرنے سے خود بخود معرض وجود میں آجائیں گی۔

"اور جب مارکسیت کا مستقبل کے بارے میں یہ تصور بالکل "لغو" نظر آتا ہے تو اس کا ماضی کا تصور بھی ایک قسم کی "علمی جہالت" معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی نفسِ انسانی کی حقیقت، اس کے مزاج اور اس کی تاریخ کو یکساں طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔

اور جب تک یہ جہالت اور لغویات مارکسیت کی بنیاد ہیں ہمیں ہرگز کوئی امید نہیں کہ اس کی بنیاد پر انسانیت کے لیے کوئی قابلِ عمل نظامِ زندگی قائم ہو گا۔ الّا یہ کہ اس

میں اتنی ہی گمراہی ہو گی جتنی کہ انسانی فطرت کے حقیقی داعیات سے اغماض کا میلان، اُن داعیات سے اغماض جو اس تصور سے متصادم ہیں۔ اسی وجہ سے مارکسیت زندگی کے عملی میدان میں اپنے بڑے اہم نظریات کو ترک کر دینے پر مجبور ہو گئی جنہیں وہ مقدس احکام کا درجہ دیتی تھی اور اپنے اس طرزِ عمل کے جواز میں یہ کہا کہ مارکسیت ایک تغیر پذیر مذہب ہے اور ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کیا کہ زندگی کے حتمی اصولوں کو کسی مذہب نے اتنا قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جتنا کہ مارکسیت نے۔

انسانی فطرت کے داعیات نے مارکسیت کے بڑے بڑے اصولوں کا ابطال کر دیا ہے اب دو ہی چیزیں ایسی باقی رہ گئی ہیں جن کے بل بوتے پر یہ نظام قائم ہے ایک "ریاست" اور دوسرے پولیس کے تحت ایک بے حس نظمِ اجتماعی۔ رُوسی عوام ان دونوں سے زارِ رُوس کے زمانے سے پوری طرح واقف ہیں۔

مارکسی نظریے کی رُو سے تو ریاست کو دن بدن کمزور اور زوال پذیر ہونا چاہیے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا دائرۂ کار روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور وہ قوم کی ہر شے کو نگلتی جا رہی ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ جو مارکسیت حکومت کے بغیر ایک نظمِ اجتماعی کے قیام کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتی تھی وہ ایک ایسی ہمہ گیر کلیت پسند اور مستبد حکومت کے قیام پر منتج ہوتی ہے جس کے تحت فرد، جماعت اور فطرتِ انسانی کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ مارکسیت بحیثیت مذہب کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ ایک "بے نظیر جہالت" ہے۔ جہاں تک اُس کے آمرانہ نظام کا تعلق ہے جو پولیس کے ظلم و جبر کے بل بوتے پر چل رہا ہے وہ کوئی نیا نہیں بلکہ اہلِ رُوس زار کے زمانے سے پہلے کے اُسے جانتے ہیں ممکن ہے کہ مجبور و بے بس (غیر ترقی یافتہ) قومیں اُسے کچھ مدت کے لئے گوارا کر لیں مگر

وہ انسان جو اپنے وجودِ انسانی کا کچھ بھی شعور و احساس رکھتے ہیں اسے زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ وہ قومیں جو اس نظام کے دباؤ کے نیچے پس رہی ہیں اُن کی فطرت بھی اس سے بُری طرح متصادم ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ قومیں مارکسیت سے پہلے ایک عرصہ تک ظالمانہ قیصریت کے ماتحت رہیں جو پولیس کی دہشت انگیزی کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہی تھی اور باوجود اس کے کہ ایک قلیل التعداد اشتراکی گروہ اہلِ ملک کی نفع اندوزی کی چیزوں پر مسلط ہے اور باوجود اس کے رزق و معاش کے سارے وسائل پر حکومت کا قبضہ ہے (رزق و معاش کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو گردنوں کو خم کر دیتا ہے!) اور باوجود اس کے کہ بچوں اور نوجوانوں کی مختلف تنظیموں کے ذریعے نسلِ نو کو اشتراکی بنانے کا انتظام کیا گیا ہے اور باوجود اس کے کہ ذرائع نشر و اشاعت پر حکومت کا قبضہ ہے اور سارے تعلیمی اداروں کے اساتذہ اشتراکی آئیڈیالوجی پر عمل پیرا ہیں اور اس کے باوجود کہ جس شخص میں اشتراکی نظام سے عدمِ وفاداری کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے اُسے عملِ تطہیر کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اس نظام کا اس حد تک کمزور اور فطرت سے متصادم ہونا ناگزیر ہے کہ یہ سارے ظالمانہ حربے اس کو جمہور کی بغاوت سے یا بالفاظِ دیگر فطرت کی بغاوت سے محفوظ و مامون نہیں رکھ سکتے کیونکہ انسانی فطرت اس طرح کے بے تکے نظام کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی اور کسی نظام کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ وہ دہشت انگیزی (Terrorism) کے سہارے پر قائم ہو۔

اسی لیے برٹرینڈ رسل کی پیش گوئی کوتاہ نظری اور مادی اسباب کے بالکل سطحی تجربہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ وہ مادی طرزِ فکر کے محدود دائرے سے باہر نکلا ہی نہیں۔ وہ ہر حال میں مادی تہذیب کا زندانی ہے۔

یہ مسئلہ اس سے بہت زیادہ عمیق اور جامع ہے۔ یہ مسئلہ اس تہذیب کا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے عطا کردہ نظامِ زندگی سے بے تعلق ہے۔ یہ اُن اجتماعی نظاموں، اسالیبِ فکر اور خود ساختہ مذاہب کا مسئلہ ہے جو ایک ہی صحیح ترین سرچشمے (یعنی ذاتِ خداوندی) سے نہیں پھوٹے۔ اسی لیے ان خود ساختہ مذاہب نے انسان کو اس کائنات کی حقیقت، اس کے اپنے پیدا کرنے والے سے تعلق، اس کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام کی حقیقت اور اس کے وجودِ انسانی کا مقصد و منتہا اور اس مقصد کے حصول کے ذرائع کے متعلق کوئی صحیح ترین تفسیر و تعبیر نہیں دی۔

دین و دنیا کی تفریق ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی بنیاد پر قائم ہونے میں سفید فام انسان کی دنیا کے سارے مروجہ نظام برابر ہیں اور جس کے بارے میں روسی، امریکی، انگریز، فرانسیسی، سویڈن والے، سوئٹزرلینڈ والے اور مشرق و مغرب میں ان کی پیروی کرنے والے سب کے سب ایک ہی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔

سفید فام انسان کی دُنیا میں جملہ مروجہ نظاموں میں اس لحاظ سے کوئی حقیقی فرق نہیں کہ ان سب کا مبدا و سرچشمہ ایجادِ بندہ ہے اور اس میں تعجب نہیں کہ سرمایہ دار امریکہ میں عبادت گاہوں کے دروازے لوگوں پر کھلے ہوں یا کمیونسٹ روس میں بند ہوں یا اشتراکی سویڈن میں کفر و الحاد کو کھل کھیلنے کی ضمانت دے کر عبادت گاہوں کو بالکل درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ ان رسمی اور ظاہری پابندیوں کا کیا ہے جب کہ ان ممالک کے اجتماعی نظاموں اور فکری مذاہب کا سرچشمہ وہ الٰہی اعتقادی تصور نہیں جو کائنات کی حقیقت، اس کے اپنے خالق سے تعلق، اس کائنات میں انسان اور اس کے مرتبہ و مقام کی حقیقت اور اس کے انسانی وجود کے مقصد و منتہا کی صحیح ترین تفسیر و تعبیر پیش کرتا ہے۔

یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جو نظامِ اجتماعی کی بنیاد بن سکتے ہیں اور انہی بنیادی عناصر سے وہ صحیح ترین اسالیبِ فکر ماخوذ ہیں جن کا تعلق فطرتِ انسانی سے ہے اور جو انسان کی حقیقی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔

اصل صورتِ مسئلہ یہ نہیں جسے برٹرنڈ رسل ایک محدود فکری دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں۔ اُن کا اندازِ فکر دُوسرے اُن مغربی مفکرین سے مختلف نہیں جو اپنے خاص ماحول، تہذیب اور اپنی اس ہلاکت خیز تاریخ کے پابند ہیں جو کلیسا کے ظلم و جور سے عبارت ہے۔ پھر وہ دین و دُنیا کی اس تفریق سے متاثر ہیں جو پانچ صدیوں کے تلخ تجربات کے دوران وقوع پذیر ہوئی۔

پھر کیا ہے؟

پھر ایک خلا ہے جو مغربی تہذیب کی رُوح اور اس کے تمام مذاہب اور نظاموں پر حاوی ہے۔ ایسا خلا کہ جس میں انسان کی رُوح گھُٹتی ہے اور جس میں انسان اور اس کے انسانی خصائص کی قدر و قیمت گھٹ رہی ہے جب کہ بے جان اشیا کے ڈھیر لگ رہے ہیں اور ان کی قدر و قیمت بڑھ رہی ہے مگر اس کے مقابلے میں ذی رُوح انسان کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ یہ ایک ایسا خلا ہے جس میں حیاتِ انسانی کی نشوو ارتقا مخدوش ہے بلکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ حیاتِ انسانی، مادی پیداوار، علمی فتوحات اور صنعتی ترقی کے باوجود اضمحلال اور انحطاط کا شکار ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے خود اپنے موجودہ تمدنی نظام کو قائم کرتے وقت اپنی فطرت اور اس کی حقیقی ضروریات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

مادی تہذیب کی چمک دمک کو ہماری نظروں کو اس قدر خیرہ نہیں کر دینا چاہیے کہ

ہم اس سیاہ بختی سے صرفِ نظر کرلیں جس سے انسانیت اس تہذیب کے سایے میں دوچار رہی ہے اور فضا میں چھوڑے جانے والے راکٹ اور مصنوعی سیارے ہمیں اس قعرِ ذلت سے غافل نہ کردیں جس میں انسان اور اس کی بُنیادی اقدار گر رہی ہیں۔

انسان اس رُوئے زمین میں سب سے زیادہ فضیلت و شرف کا مالک ہے۔ وہی اس زمین میں بنیادی وجود ہے۔ وہ قُدرت کے لاتعداد عطیات سے بھر پُور فائدہ اٹھانے والا ہے اور زمین کی ہر چیز اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے یا لگی ہونی چاہیے اور انسان کا حقیقی جوہر انسانیت ہے جو اس کے عروج و زوال کا سب سے اعلیٰ معیار ہے اور اس بات کا معیار کہ جس تہذیب و تمدن میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ کس حد تک اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہے یا کس حد تک اس کی فطرت سے متصادم ہے اس کی رُوحانی بالیدگی کا مظہر ہے۔

تہذیبِ حاضر میں جب ہم نے انسان کا جائزہ لیا تو ہمیں معلوم ہوا:

- وہ انسانی صفات و اقدار میں بہت پست ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔
- وہ اپنے نظریات، سمجھ بُوجھ اور اخلاق میں مائل بہ انحطاط ہے۔
- وہ آلات کا غلام اور تابع بن کر رہ گیا ہے۔
- وہ جنسی روابط میں حیوانوں سے بھی پست تر ہو گیا ہے۔
- اس نے اپنے حقیقی فرائض کو بالکل بیکار اور بے فائدہ سمجھ کر پسِ پشت ڈال دیا ہے۔
- وہ بد بختی، قلق اور تحیر کا شکار ہو چکا ہے اور عصبی اور نفسیاتی امراض مثلاً خود سری، ضعف العقل، جنون اور ذوقِ جُرم وغیرہ میں مبتلا ہو چکا ہے۔

- وہ اپنے آپ سے اور اُن خطرات اور شورشوں سے گریزاں ہے جن میں اُسے مادی تہذیب اور اس کے مختلف اجتماعی، سیاسی، اخلاقی اور فکری نظاموں نے گھیر رکھا ہے۔
- وہ آوارہ و سرگرداں ہے۔ وہ اپنے غم و اندوہ کو ان چیزوں سے ختم کرنا چاہتا ہے جو اُس کی رُوح، جسم اور اعصاب کے لیے تباہ کن ہیں۔ مثلاً خواب آور گولیاں اور شراب استعمال کرتا ہے اور یاس و قنوطیت اور خود کو ہلاکت میں ڈالنے کا سبق دینے والے مذاہب اختیار کرتا ہے۔
- وہ اپنی نسل کو زندہ درگور کر رہا ہے (ضبطِ ولادت سے کام لے رہا ہے) یا برقی ریفریجریٹر اور برقی حمام خریدنے کے لیے اپنی اولاد بیچ رہا ہے۔ (یورپ سے ایسی کئی خبریں ہم تک پہنچی ہیں)۔

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ انسانیت اس بدترین صورتِ حال سے دوچار ہے اور سائنس نے رُوحِ انسانی کے تقاضوں کو بالکل نظرانداز کر کے مادی اور تمدنی زندگی کے لیے جو سہولتیں فراہم کی ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس انحطاط کا دھارا نہیں بدل سکتی۔ جس میں پُوری نوعِ انسانی اس وقت گرفتار ہے اور اس بدبختی اور فلاکت کا درماں نہیں بن سکتی جو انسان پر عذاب بن کر مسلط ہو رہی ہے۔ پھر وہ اس تہذیب کی ناکامی اور بالآخر بربادی کی راہ نہیں روک سکتی۔ کوئی علمی انکشاف اس بات کا مداوا نہیں بن سکا کہ انسان (باوجود اس سائنسی ترقی کے) ایک ایسے نظام کی اشد ضرورت محسوس کر رہا ہے جو بنیادی طور پر اُن عیوب سے منزہ ہو جو حیاتِ انسانی میں فساد کا سبب بنے ہیں اور جن کی وجہ سے انسان علم و عرفان اور تمدنی ترقی کے ثمرات

سے محروم ہو گیا ہے۔ اُسے ایک ایسے نظامِ زندگی کی ضرورت ہے جو اس کے لیے باری تعالیٰ کے منشا کے مطابق اپنے مقصدِ وجود کو حاصل کرنے میں ممد و معاون ہو اور جس میں وہ اپنی عقل، علم اور تجربہ کو یوں بروئے کار لاسکے کہ وہ اس کی حقیقی ضروریات اور فطری مقتضیات سے ہم آہنگ ہو سکیں۔

ان حالات میں ہم کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سفید فام آدمی کا دورِ عروج اب ختم ہو چکا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ سفید فام آدمی رُوسی ہو یا امریکی، انگریز ہو یا فرانسیسی، سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا ہو یا سویڈن کا اس کا دورِ عروج ختم ہو چکا ہے۔ کیونکہ تاریخ یورپ اور عالمِ مغرب کے تمام مذاہب اور نظام ہائے زندگی میں دین و دنیا کی جو تفریق رُونما ہوئی تھی اُس نے سفید فام انسان کے دورِ عروج کے خاتمے کی حدود مقرر کر دی تھیں۔

اُن تمام مذاہب و مناہج اور نظام ہائے زندگی کے لیے تصورِ اعتقادی کی بحیثیت ایک اساس کے ضرورت ہے جن پر آج کل انسانی زندگی کا دار و مدار ہے۔

کائنات، اس کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے وجود کے مقصد و منتہا کی صحیح تعبیر و تفسیر بہت ناگزیر ہے۔ یہ صحیح تفسیر و تعبیر اور وہ اعتقادی تصور جو حقیقت کے مطابق ہے۔ بشرطیکہ حقیقت ویسی ہو جیسی کہ وہ ہے نہ کہ ویسی جیسی لوگ اُسے عقل کوتاہ بین، خواہشاتِ نفسانی اور تغیر پذیر جذبات کی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کی ضروریات میں سے سب سے اہم ضرورت ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے سفید فام انسان کی تہذیب میں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا بلکہ یہ تہذیب اور مشرق و مغرب میں اس کے سارے مروجہ نظام یکساں طور پر اس کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔

انسان تو روزِ آفرینش ہی سے انسان ہے۔ وہ ایک عقیدے کا محتاج ہے جو

اس کے نفس کی اصلاح کرے اور جو اس کے نظریات و افکار کا منبع و سرچشمہ ہو اور اس کی زندگی اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات کی ایک جامع تعبیر و تفسیر پیش کرے اور اسے بتائے کہ اس کا اپنا اور کائنات کا خدائے برتر سے کیا ربط و تعلق ہے اور اس کے لیے اُن ارفع مقاصد کی نشاندہی کرے جو اس کی اپنی ذات اور نسل کے مادی مفادات سے بلند تر ہوں اور جو اس کے حاضر و موجود سے ارفع و اعلیٰ ہوں اور جو اس کا تعلق اس ذات برتر سے استوار کر دے جو اس کی نگران و حکمران ہو اور جس سے وہ محبت بھی کرے اور ڈرے بھی اور جس کے غضب سے بچنے کی کوشش کرے اور اس کی رضا کا طالب ہو اور جلائق کے کام میں جس کی مدد کی وہ امید رکھے اور نیز اپنی کمزوری کے اس کے سامنے جانے میں شرمسار ہو اور جس سے وہ اس مشقت اور پوری پوری جزا کی اُمید رکھے جو اُن سارے نقصانات کی تلافی کر دے گی جو اسے شر کے خلاف صف آرا ہونے میں اُٹھانے پڑیں گے اور جس سے وہ اپنی ساری زندگی وابستہ کر دے اور جس سے وہ اپنا نظامِ زندگی حاصل کرے اور فکر و عمل میں اس کی رہنمائی حاصل کرے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ عبادت کے طور طریقے اس سے سیکھتا ہے۔ اسی انداز سے حیات انسانی کی فطری وحدت قائم ہو سکتی ہے جس کے مختلف گوشوں کے درمیان کوئی تزاحم و تصادم نہ ہو۔

بلاشبہ بعض اوقات جسمانی احتیاجات اور ان کو پورا کرنے کے مختلف مادی وسائل انسان کی توجہ اپنی طرف منتقل کرا لیتے ہیں مگر یہ احتیاجات انسان کی ساری زندگی پر حاوی نہیں اور ان کی تکمیل ساری انسانی احتیاجات کی تکمیل نہیں کی جا سکتی۔ ابھی ایک احتیاج کی تکمیل نہیں ہو پاتی کہ دوسری احتیاج اُبھر آتی ہے اور اس دوسری احتیاج کو جو لگ

شراب، لباس وغیرہ پُورا نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ احتیاج کسی اور ہی قسم کی ہے۔ یعنی انسان کی اپنے سے برتر اور عظیم قوت پر، اس عالمِ محسوسات سے ماورا، ایک دُوسری ہی دُنیا پر اور اس حیاتِ دنیوی سے وسیع تر زندگی پر ایمان کی احتیاج۔ نیز انسانی اور جسم کے مابین، انسان کے قلب کا تزکیہ کرنے والے قانون اور اس کی ساری زندگی کے نظام کے مابین اور اس کے ذاتی کردار و اعمال اور اس کے اِردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی حرکت کے نظام کے مابین کامل ہم آہنگی کی احتیاج۔ المختصر اس معبودِ واحد کی احتیاج جس سے انسان اپنے قلب و رُوح اور معاشرے کے ضوابط سیکھے۔

اور کوئی نظام جب تک ان مختلف احتیاجات کو ایک ہی وجود میں پُورا کرنے کی ضمانت نہ دے انسانی زندگی کو خوش بختی سے ہمکنار نہیں کرسکتا اور یہی وہ صفت ہے جو سفید فام انسان کی تہذیب میں مفقود ہے اور اسی لیے سفید فام آدمی کا دورِ عروج و اقتدار ختم ہوگیا ہے۔

دلدوز نالے

اب ہر جگہ اس حقیقت کے اعتراف میں مختلف قسم کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ ایمان کی حلاوت سے محروم سفید فام آدمی کی مادی تہذیب کے زیرِ سایہ بنی نوعِ انسان کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ کبھی تو ان صداؤں سے اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ ساری نوعِ انسانی قعرِ مذلت میں گر جائے گی اور کبھی اس بات کا خطرہ کہ وہ مارکسیت کی آغوش میں چلی جائے گی۔ اسی طرح انسان کو اس پُرخطر صورتِ حال سے بچانے کی تجاویز بھی مختلف ہیں لیکن وہ سب کی سب کوشش ناکام کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ وہ مسئلہ کو اس کی اساس و بنیاد سے حل کرنے کی کوشش نہیں کرتیں اور نہ اس مسئلے کی گہری اور دُور تک پھیلی ہوئی جڑوں تک پہنچتی ہیں۔ ان صداہائے خوف و خطر اور اس خطرے سے بچنے کی تجاویز سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی عقلیت کتنی کوتاہ بیں ہے اور کسی مسئلے کے اصل اسباب و وجوہ کو دیکھنے سے محروم!

ہم ان بدنصیب آشفتہ سروں کو "سائنس" کے قفس میں پابہ زنجیر دیکھتے ہیں جب وہ اس قفس سے کُود کر نکلنا چاہتے ہیں، تو اپنی انتہائی کوشش کے باوجود قفس کے اندر ہی ایک زقند لگا کر رہ جائیں گے یا یہ آشفتہ سر "عامذ موجود" کے قفس میں مقید ہیں اور

اس سے ماورا کچھ دیکھنے سے معذور ہیں۔ اندریں صورتِ حال اسلامی نظامِ زندگی کے علمبرداروں پر بڑی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اس "قفسِ علمِ حاضر" (Science and what Exist at Present) کو توڑ کر انسانیت کو حقیقی نجات سے ہمکنار کریں جس کا انسانی وجود ہی خطرے میں ہے اور صورتِ حال کا آزادی کے ساتھ جائزہ لے کر اس مشکل کے حل کے لیے ایک جامع خاکہ پیش کریں جس سے آج کل انسانیت دوچار ہے اور اس خاکے کو مدِنظر رکھ کر انسانی مسائل کے حل کے لیے پیش قدمی کریں۔

ہم اپنے موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ ہم اُن بہت سی صدہائے خوف و خطر کے نمونوں میں سے صرف دو نمونے پیش کرتے ہیں اور اس خوف و خطر سے بچنے کے لیے پیش کردہ تجاویز بھی بیان کرتے ہیں جو کوتاہ نظری اور لاعلمی کا شاہکار ہیں۔ ایک نمونہ تو اس صدی کے بہت بڑے اہلِ علم ڈاکٹر الکسس کیرل کا ہے اور دُوسرا دَورِ حاضر کی ایک بڑی اہم سیاسی شخصیت امریکہ کے سابق وزیرِ خارجہ مسٹر ڈلس کا۔

ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب (Man the Unknown) جس کا عربی ترجمہ "الانسان ذلک المجہول" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس بات کی کافی شہادت ہے کہ موجودہ مادی تہذیب نے بعض اہم انسانی خصائص کو ختم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی کتاب میں اُن خطرات سے آگاہ کیا ہے جو طبعی قوانین کی خلاف ورزی کے سبب بنی نوعِ انسان کے سر پر منڈلا رہے ہیں اور واضح طور پر لکھا ہے کہ سائنس انسان بلکہ اس کی تکوین کے وسیع تر حقائق سے بالکل ناآشنا ہے۔

ذیل میں اس کتاب کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"اس کتاب کا مقصدِ تالیف یہ ہے کہ اپنے عہد کے انسانوں کے

بارے میں عوام کو صحیح علمی معلومات فراہم کردوں۔ مغربی تہذیب کی کمزوریوں کا اب ہمیں احساس ہونے لگا ہے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت جدید تہذیب اور معاشرے کے افکار و نظریات کو پس پُشت ڈالنے کے لیے بیتاب نظر آتی ہے۔ انسانوں کی اس اکثریت کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اسی طرح میں نے ان لوگوں کے لیے یہ کتاب لکھی ہے جو نہ صرف عقلی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں بلکہ صنعتی تہذیب کو یکسر بدل کر انسانیت کے لیے فلاح و ترقی کے ایک نئے تصور کو پیش کرنے کے آرزومند بھی ہیں۔" (مقدمہ کتاب صفحہ ۱۱-۱۲)

" تہذیب حاضر اس وقت بڑے کٹھن مرحلے سے گزر رہی ہے۔ یہ انسان کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ اس میں اس کی حقیقی فطرت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس نے سائنسی اکتشافات، انسانی خواہشات و توہمات، انسان کے اپنے وضع کردہ نظریات اور جبلی رجحانات کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ تہذیب ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے یہ ہمارے لیے بالکل ناموزوں ہے۔" (صفحہ ۳۸)

• صنعتی زندگی کی تنظیم کرتے ہوئے اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ انسان کے جسم اور عقل پر کارخانوں کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔ جدید صنعت اس اصول پر قائم ہے کہ کم سے کم مصارف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو تاکہ فرد یا گروہ حتی المقدور کافی دولت حاصل کر سکے۔ یہ بدنصیبی ہے کہ انسان جو آلاتِ پیدائش سے استفادہ کرنے والا سب سے اہم کارکن ہے

اس کے مزاج و طبیعت کو سمجھے بغیر مشین کو غیر معمولی وسعت دے دی گئی ہے اور کارخانوں کے وجود نے جس مصنوعی زندگی کی داغ بیل ڈالی ہے افراد اور ان کی اولاد پر اس کے اثرات کو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔"

(صفحہ ۴۰)

" تمام معاملات کی جانچ پرکھ کے لیے انسانی فلاح و بہبود اصل معیار ہونا چاہیے لیکن آج کے دَور میں انسان دنیا میں ہی اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ وہ انسانیت کی تعمیر اپنے ارادوں کے مطابق نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اپنی فطرت کی معرفت حاصل نہیں۔ پھر علوم جمادات کا علوم حیات سے بڑھ جانا ایک عظیم حادثہ ہے جس سے انسانیت دوچار ہوئی ہے۔ ہماری کوتاہ اندیش عقل اور دورِ حاضر کی ایجادات کا پیدا کردہ اجتماعی ماحول ہمارے لیے کسی لحاظ سے بھی موزوں نہیں۔ ہم ایک بدنصیب قوم ہیں جو اخلاقی اور عقلی اعتبار سے انحطاط پذیر ہے۔ وہ قومیں جن میں صنعتی تہذیب نے خوب خوب ترقی کی ہے ضعف و اضمحلال میں گرفتار ہیں اور وہ بڑی سُرعت کے ساتھ بربریت اور درندگی کی آغوش میں جا رہی ہیں اور اُن کو اس بات کا احساس بھی نہیں۔ اُن کے ناقص علوم و فنون نے ان کے گرد جس نوعیت کا معاندانہ ماحول پیدا کر رکھا ہے اس کے بُرے اثرات سے محفوظ رکھنے کا ان کے پاس کوئی انتظام نہیں۔ درحقیقت ہماری تہذیب نے سابق تہذیبوں کی طرح ایسے رُوح فرسا حالات پیدا کر دیے ہیں جن میں انسان کا زندہ رہنا بھی امر محال نظر آتا ہے۔ اس کے کچھ اسباب ہیں جن تک انسان کی رسائی نہیں۔

جدید شہروں کے باشندوں کو آج جو مسائل درپیش ہیں وہ سب ناقص سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظاموں کی پیداوار ہیں۔" (صفحہ ۴۴)

" محض ایجادات اور اختراعات کی زیادتی سے ہمیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم طبیعیات، فلکیات اور کیمیا کے انکشافات کو اتنی اہمیت نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض سائنس ہمارے لیے باعثِ تکلیف و ضرر نہیں۔ مگر جب اس کی چکاچوند روشنی ہماری بصیرت کو اندھا کر دیتی ہے اور ہمارے افکار و نظریات بے جان ملٹے کے حسن و جمال سے متأثر ہو جاتے ہیں تو پھر یہ ہمارے لیے ایک خطرہ بن جاتی ہے۔ اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ خود اپنی معرفت حاصل کرے اور ان اسباب پر توجہ دے جو اس کے اخلاق دیوالیہ پن اور فکری افلاس کے ذمہ دار ہیں۔ انسان کے آرام و آسائش میں ترقی اور تہذیبِ حاضر کی خیرہ کن چمک دمک کا کیا فائدہ؟ جب اس کی کمزوریاں اُسے ان وسائل سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم نہیں کرتیں۔ یہ کوئی مناسب طرزِ عمل نہیں کہ ہم ایک ایسا اندازِ زیست اختیار کریں جو ہمارے اخلاق انحطاط اور انسان کے اچھے اور اعلیٰ جذبات کی موت کا باعث ہو۔"

(صفحہ ۶۰)

" موروثی اثرات اور ماحول دونوں مل کر انسانی سیرت کی تشکیل کرتے ہیں اور وقت کے غالب رجحانات اس کے فکر و نظر کے زاویوں کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ ہم گزشتہ صفحات میں قدرے تفصیل کے ساتھ یہ حقیقت

بیان کر چکے ہیں کہ جدید تمدن نے انسانی عادات اور طور طریقوں پر کس نوعیت کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ ٹھوس حقیقت اب ہمارے سامنے بالکل کھل کر آگئی ہے کہ ٹیکنالوجی نے ہمارے لیے جو اجتماعی ماحول پیدا کیا ہے ہم اس کے ساتھ کبھی مطابقت پیدا نہیں کر سکتے اور یہ کہ ماحول انسان کے لیے ضعف و اضمحلال کا باعث ہو رہا ہے۔ تنہا سائنس اور ٹیکنالوجی کو اس اندوہناک صورت حال کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ممنوع اور مباح کے درمیان فرق کرنا چھوڑ دیا ہے۔ قوانین طبیعی کو توڑا ہے اور اس ارتکاب جرم کے لیے ہمیں لازمی طور پر سزا ملنی چاہیے۔ سائنس کے معتقدات اور صنعتی اخلاق کو حیاتیاتی حقائق نے بالکل پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ حیات انسانی جب بھی ممنوعہ راستوں پر سے گزرنے کی کوشش کرے گی تو اُسے ایک ہی نوعیت کے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس پر اضمحلال طاری ہوگا اور وہ بربادی سے دوچار ہوگی۔ بے جان مادے کے علوم نے ہمیں فکری اور عملی لحاظ سے ایک ایسی دنیا میں دھکیل دیا ہے جو ہماری دنیا نہیں۔ ہم نے ان علوم کے کڑوے ثمرات کو بغیر سوچے سمجھے جھولی میں ڈال لیا ہے۔ اُن کے چکھنے سے انسان کے اندر تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوا ہے۔ اس کی فکری صلاحیتیں کمزور پڑ گئی ہیں اور وہ اخلاقی اعتبار سے برباد ہوا ہے۔ اس میں اب یہ قوت باقی نہیں رہی کہ اپنے نفس پر یا اپنے تخلیق کردہ اداروں پر مؤثر طور پر اثر انداز ہو سکے۔" (صفحہ ۳۲۲)

"زندگی کا وہ مادی نظریہ جو گزشتہ تین صدیوں سے انسان کے

دل و دماغ پر مستولی ہے اس سے آخر آسانی کے ساتھ کس طرح نجات
حاصل کی جا سکتی ہے؟ اگر یہ سائنسی تمدن اس راہ کو چھوڑ دے جس پر کہ یہ
نشاۃ ثانیہ کے وقت سے گامزن ہے اور زندگی کے حقائق کی طرف متوجہ ہو تو
فی الفور عجیب و غریب نتائج پیدا ہوں گے۔ بے جان مادے کی برتری کا
خاتمہ ہو گا۔ انسان کی حقیقی قوتوں کو بھی وہی مقام حاصل ہونے لگے گا جو اس وقت
اس کی دنیوی سرگرمیوں کو حاصل ہے۔ پھر اخلاق، ادب، جمالیات اور مذہب
کا انسان اسی ذوق و شوق سے مطالعہ کرنے گا جس انہماک کے ساتھ وہ آج
علم ریاضی، علم طبیعیات اور علم کیمیا کا مطالعہ کر رہا ہے۔ تعلیم کے جدید طریقے
احمقانہ معلوم ہوں گے اور مدارس اور جامعات اپنے نصاب میں خاطر خواہ
تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوں گی۔
پھر حکماء، اطباء اور جسمانی صحت کے نگہبانوں سے یہ سوال کیا جائے
گا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم جسمانی امراض کے علاج پر تو اتنی توجہ دیتے ہو مگر
عقلی اور اعصابی عوارض کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتے۔ روحانی صحت کے
بارے میں تم نے کیوں غفلت اور لاپرواہی کی روش اختیار کر رکھی ہے جو
مریض کسی متعدی مرض کا شکار ہو تم اسے دوسرے افراد سے الگ رکھتے
ہو لیکن تم ان ذہنی مریضوں کو عام معاشرے سے علٰحدہ رکھنے کی کیوں کوشش
نہیں کرتے جو عقلی اور اخلاقی عارضوں میں مبتلا ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جن
بری عادات سے جسمانی عوارض پیدا ہونے کا خدشہ ہو وہ تو تمہارے نزدیک
خطرناک ہیں مگر وہ اخلاقی عادات جن سے انسانیت کے اندر برائی اور جرائم

پھیلتے ہوں، وہ تمہاری نظر میں قطعاً کسی خطرے کا موجب نہیں۔

ماہرینِ معاشیات پر جلد ہی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ انسان اپنے اندر شعور اور احساس رکھتا ہے اور اس بنا پر اُسے کام، خوراک اور فراغت کے علاوہ بھی بعض چیزوں کی احتیاج محسوس ہوتی ہے اور وہ انہیں اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا کہ ان مادی ضروریات کو۔ پھر ان ماہرین پر یہ حقیقت بھی عیاں ہوگی کہ معاشی اور مالیاتی بُحران مادی اسباب کے نتائج نہیں ہوتے بلکہ اُن کے پیچھے عقل اور اخلاق جیسے بعض غیر مادی عوامل بھی کار فرما ہوتے ہیں۔

آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہم شہری زندگی کے غیر شائستہ اطوار کو اپنانے، کارخانوں اور دفاتر کے ناقابلِ برداشت بوجھ کو اٹھانے، شرفِ انسانی کو معاشی مفادات پر اور عقل کو سیم و زر پر قربان کرنے کے لیے مجبور کر دیے جائیں۔ ہمیں اُن ایجادات اور اکتشافات کو اُٹھا کر دیوار پر مار دینا چاہیے جو انسانیت کے نشوونما میں حائل ہوں۔

فکر و نظر کے اس انقلاب کے بعد معیشت حیاتِ انسانی کی غایت رُشی نہ قرار پائے گی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب انسان مادیت کے تسلط سے آزاد ہوگا اس کی زندگی کے متعدد گوشوں میں بھی عظیم انقلاب پیدا ہوگا۔ اس تبدیلی کو جدید تمدن کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ان نئے افکار کی پُوری طرح مزاحمت کرے گا۔" (صفحہ: ۳۲۹، ۳۳۱)

" یہ ضروری نہیں کہ مادیت کی ناکامی لازمی طور پر ایک خوش گوار رُوحانی ردِ عمل ہی کی صُورت میں رُونما ہو۔ ٹیکنالوجی اور مادے کی پرستش

کے بُرے انجام سے دوچار ہونے کے بعد یہ عین ممکن ہے کہ انسان مجرد عقل پرستی کا مسلک اختیار کرے۔ تنہا نفسیات کی عمل داری نتائج کے اعتبار سے عضویات، طبیعیات اور علم کیمیا کے تسلط سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ انسانیت کو جتنا نقصان فرائڈ کے نظریات سے پہنچا ہے وہ میکانیت سے نہیں پہنچا۔ مادے کے مقابلے میں عقل کی پرستش سے انسان کے اس غلط نقطہ نظر کی اصلاح نہ ہو سکے گی جو نشاۃ ثانیہ سے انسان کو بربادی کے راستے پر لے جا رہا ہے۔ یہ بات قطعاً بعید از قیاس نہیں کہ یہ تبدیلی نوع بشری کے لیے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ تباہ کن ثابت ہو۔" (صفحہ ۳۲۲،۳۳۱)

یہ ہے ڈاکٹر کیرل کی اُس صدائے دردناک کا خلاصہ جو اُس نے آنے والے خطرے سے انسانیت کو آگاہ کرنے کے لیے بلند کی ہے مگر اب سوال یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس آنے والے خطرے سے نبٹنے کے لیے کیا تجاویز ہیں؟ وہ اس اندوہناک صورتِ حال سے نجات کے لیے کیا حل پیش کرتے ہیں، وہ کونسی راہ ہے یا وہ کونسا نظام عمل ہے جسے اختیار کر کے انسان اپنی اس غلطی کی تلافی کر سکے جو نشاۃ ثانیہ کے وقت سے مادہ پرستی کے مسلک کو اختیار کر کے اُس نے کی ہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ مادے کو بالکل نظر انداز کر دینا کسی دوسری غلطی کا سبب بن جائے۔ بلکہ کوئی ایسا متوازن سا نظام عمل ہو جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہو؟ وہ کونسا نظام ہے جو مادے پر انسان کی سیادت تفوق قائم کیے بغیر اس کو بالکل نظر انداز کر دے یا فرائڈ کے گمراہ کن نظریات اور قرونِ وسطیٰ کی ناقابلِ عمل رہبانیت کے دامن میں پناہ لے۔

نوع بشری کے سر پر منڈلانے والے اس عظیم حادثہ کے گہرے ادراک و احساس اور

صنعتی تمدن کو بدلنے اور انسانی فلاح و ترقی کے لیے کسی اور نظریے کو پیش کرنے کی ضرورت کے اعلان کے بعد ڈاکٹر کیرل اس اندوہناک صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کیا حل تجویز کرتا ہے ؟

سُنیے اور دیکھیے کہ وہ حل کتنا عجیب و غریب ہے! ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں :

"انسان آج جس مصیبت کا شکار ہے وہ یہ ہے کہ بے جان مادے سے تعلق رکھنے والے علوم ذی رُوح کی معرفت عطا کرنے والے علوم سے غیر معمولی سبقت لے گئے ہیں۔ اس تشویشناک صُورتِ حال کو اس طرح بدلا جا سکتا ہے کہ ہم مادی اشیاء کی بہ نسبت اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کریں۔ اس معرفت و خود آگاہی سے ہمیں اس بات کا پتہ چلے گا کہ عہدِ حاضر کی مادی زندگی ہمارے شعور اور وجدان پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اور ہم اپنے ماحول کے ساتھ کس طرح مطابقت پیدا کر سکتے ہیں اور اگر تغیر ناگزیر ہو تو اس ماحول کو کس حد تک بدل سکتے ہیں۔ اپنی فطرت کی صحیح معرفت، اپنی صلاحیتوں کے ٹھیک اندازے اور اُن سے صحیح استفادے کی راہ میں ہم اپنی کمزوریوں اور اخلاقی پستیوں سے آشنا ہوں گے۔ ہمارے پاس اپنی جسمانی اور رُوحانی تگ و دَو کو سمجھنے، حلال و حرام کے درمیان تمیز کرنے اور اس بات کے جاننے کا کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو بدلنے پر قُدرت نہیں رکھتے، کوئی دُوسرا ذریعہ نہیں۔ تہذیبِ جدید نے چونکہ بقا کے فطری حالات کو برباد کر کے رکھ دیا ہے اس بنا پر انسان کا علم دوسرے تمام علوم سے ضروری ہے۔"

(صفحہ ۲۴، ۲۵)

یہ ہے ہلاکت خیز صورتِ حال کا وہ حل جو اس نامور مغربی عالم نے پیش کیا ہے۔ کسی آدمی کا یہ تجویز پیش کرنا اور اُسے نوعِ بشری کی بقاء، اس کی انسانیت کی حفاظت اور وحشت و بربریت سے محفوظ و مامون رہنے کے مسئلہ کا واحد حل سمجھنا اور اس شخص کا یہ سمجھنا کہ علوم انسانی کا مزید مطالعہ ہی نوعِ بشری کو اس اندوہناک صورتِ حال سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تہذیب اپنے ماننے والوں کے فکر و نظر اور تصورات پر کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے۔ اس نے انہیں سائنس اور حاضر و موجود کے آہنی پنجرے میں اس طرح بند کر دیا ہے کہ اُس سے رہائی اُن کے بس سے باہر ہے لیکن موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ مسائل کا صحیح تجزیہ کرنے اور اُن کا ٹھیک حل معلوم کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان تصورات کے اس آہنی قفس سے آزاد ہو کر غور و فکر نہ کیا جائے۔

بے جان علوم کی حیرت انگیز ترقی اور ان کے مقابلے میں علوم بشری کی طرف سے انسان کی مجرمانہ غفلت جو ڈاکٹر کیرل کے نزدیک انسان کی اس تباہی و بربادی کا اصل سبب ہے، خود بخود پیدا نہیں ہو گئی بلکہ موجودہ مغربی تمدن نے انسان کی حقیقی قدر و قیمت کے بارے میں جو باطل نظریات گھڑ رکھے ہیں انہوں نے اس پریشان کن صورتِ حال کو جنم دیا ہے یہ درحقیقت ثمرہ ہے اس صحیح اعتقادی تصور سے انحراف کا جو انسان کے لیے باعثِ عزت و شرف ہے اور اس کو اس کائنات میں خداوند تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیتا ہے۔

اسی طرح وہ ساری آفات جن کا ذکر ڈاکٹر کیرل نے صنعتی نظام کے ضمن میں کیا ہے اُن اقتصادی نظاموں کی مرہونِ منت ہیں جو اعتقادی تصور اور دینی اخلاق سے متعلق تصورات سے ماخوذ ہیں اور جن کے مطابق کسی اقتصادی نظام میں دین اور اخلاق کو شامل کرنا ایک مذاق سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ موجودہ صنعتی نظام میں انسانیت کا

کری احترام اس کے روحانی خصائص اور اس کی حقیقی ضروریات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔
مغربی مفکرین نے اگر انسان اور اس کی حقیقی فطرت کے متعلق نہایت قلیل معلومات کے ساتھ یا ڈاکٹر کیرل کے الفاظ میں عدم واقفیت یا جہل مطلق کے ساتھ سیاست، اقتصادیات اور تعلیم و تربیت کی تنظیم نو کا بے جا عزم کیا ہے تو یہ جسارت یونہی بغیر کسی سبب کے ہی نہیں کرلی گئی بلکہ یہ طبعی نتیجہ ہے اس بغض و نفرت کا جو وہ وحی الٰہی اور اس نظام الٰہی سے رکھتے ہیں جو انسان کو اپنی حقیقت کی معرفت عطا کرتا ہے اور یہ مذہب بیزاری جو تہذیب فرنگ کی بنیاد تھی، تعلیمات کلیسا اور سائنسی معلومات کی آویزش سے پیدا شدہ بدترین حالات کی پیداوار تھی۔

ان اشارات سے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ معاملہ اُس سے کہیں زیادہ دقت طلب ہے جتنا کہ یہ نامور مغربی مفکر اسے سمجھتا ہے۔ وہ معاملے کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا کیونکہ وہ خود بھی مغربی تہذیب کے سایے میں نشوونما پانے والی عقلیت کا غلام ہو کے رہ گیا ہے۔

جس طرح ڈاکٹر کیرل نے یہ محسوس کیا ہے کہ انسانی اقدار اور انسانی وجود کو موجودہ صنعتی اور مادی تہذیب سے خطرہ ہے اسی طرح مسٹر ڈلس نے جو کہ امریکہ کے وزیر خارجہ تھے محسوس کیا ہے کہ امریکہ اور ساری مغربی دُنیا کو اشتمالیت سے خطرہ ہے جس کا اجتماعی نظام "مادیت" اور "تاریخ کی اقتصادی تعبیر" کی بنیاد پر قائم ہے۔ اُنہوں نے اپنی کتاب "جنگ یا اَمن" (War or Peace) میں اس خطرے کے خلاف آواز بلند کی ہے اور اس کو دُور کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔ لیکن ان کی پیش کردہ تجاویز اتنی سطحی ہیں کہ معاملے کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکیں۔ اُس نے اہل کلیسا پر وہ ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کی ہے

جن سے عہدہ برآ ہونا اُن کے بس کا روگ نہیں بلکہ کلیسا کے غلط نشو ونما کی وجہ سے ان حضرات کا جو مزاج بن چکا ہے اُسے دیکھتے ہُوئے یہ ذمہ داری بڑی عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے۔

مسٹر ڈلس اپنی کتاب مذکورہ بالا کے ایک باب "ہماری رُوحانی ضروریات" میں فرماتے

"ہماری قوم کے رگ وپے میں کسی خطرناک مرض کے جراثیم سرایت کیے ہُوئے ہیں ورنہ اس دُکھ اور اس نفسیاتی کرب میں مبتلا نہ ہوتے۔ زندگی میں دفاعی مؤقف اختیار کرنا اور ہر وقت خوف وہراس میں گرفتار رہنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ہماری تاریخ میں یہ صورتِ حال بالکل نئی ہے !"

"مادی اسباب کی کمی ہمارے حالات کو بگاڑنے کی ذمہ دار نہیں۔ اشیاء کی کثیر پیداواری اور زود پیداواری میں تو اس کرۂ ارضی پر ہمارا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ ہمارے ہاں اصل کمی تو صحیح ایمان کی ہے۔ اس کے فقدان کی وجہ سے ہمارے سارے اسباب ووسائل ہمارے لیے بیکار ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ وہ خرابی ہے جس کو نہ تو سیاست دانوں کی ذہانت، نہ مدبروں کی فطانت اور نہ اہلِ علم کی قابلیت اور نہ بموں کی قوت دُور کر سکتی ہے۔"

"جب ایک مرتبہ انسان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ مادی اسباب اس کی زندگی کے سب سے زیادہ مضبوط سہارے ہیں، تو پھر اس طرح کے تلخ نتائج جو مغربی تہذیب ہمارے سامنے لا رہی ہے، ناگزیر

ہوتے ہیں :

" ہمارے اداروں کے اندر وہ روحانی کشش باقی نہیں رہی جس کے زیر اثر ہم ان کی محافظت کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ ہمارے ذہنوں میں انتشار ہے جو ہمارے روحانی احساسات کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے معاندانہ اور مہلک خیالات ہمارے اندر اس طرح نفوذ کرتے ہیں جس طرح کہ خفیہ پولیس مجرموں کے اندر گھس کر ان کے راز پا لیتی ہے۔ پولیس کے یہ دستے ہمیں بیرونی دنیا کے دشمنوں کی سرگرمیوں سے تو بچا سکتے ہیں مگر داخلی دنیا کے ان دشمنوں سے کوئی پولیس ہماری محافظت و پاسبانی نہیں کر سکتی۔ ہماری قوم اس وقت شدید آزمائش سے دوچار ہے ——— وہ آزمائش جو انسانوں کے کسی گروہ کو مال و دولت کی کثرت اور فراوانی سے پیش آتی ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا قول ہے :

" وہ لوگ جو آسمانی بادشاہت اور سلامتی کے طالب ہیں انہیں دنیوی مال و متاع سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے۔ مگر یہ مادی ساز و سامان ہی ان کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوتا ہے اور زنگ کی طرح ان کی روحوں کو اندر ہی اندر سے نگل لیتا ہے۔"

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کی ترقی و تنزل کا ایک ہی لگا بندھا راستہ ہے۔ کچھ لوگ باری تعالیٰ کی محبت میں سرشار ہو کر انسان پر اس کے عائد کردہ فرائض کے احساس سے اس کی رضا و خوشنودی کے لیے تگ و دو کرتے ہیں ایمان و ایقان کی یہ دولت انہیں قوت، نیکی، پرہیزگاری اور حکمت و دانائی کے

اصول جو ہر عطا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ نہ صرف عاجلانہ منافع کے لیے بلکہ مستقبل میں حاصل ہونے والے دُور رس نتائج کو مد نظر رکھتے ہُوئے زندگی کی تعمیر کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں صرف اپنی بھلائی ہی نہیں چاہتے بلکہ ساری نوعِ انسانی کی فلاح کے لیے زندہ رہنے کے ڈھنگ سیکھتے ہیں جو معاشرہ ان مخلص افراد سے عبارت ہو اور جس میں یہ حیات آفریں تصورات کارفرما ہوں، وہاں فطرت کا دستِ سخاوت مرفہ الحالی پیدا کر دیتا ہے۔ مال و متاع کی یہ فراوانی جو اس معاشرے کو خدا کی اطاعت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے بالآخر خود مقصدِ حیات بن جاتی ہے۔ پھر افراد اپنے اعمال کے دُور رس نتائج سے آنکھیں پھیر کر مادی اشیا کے حصول میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اپنے ساتھ بہت سے خطرات لائی ہے۔ امریکہ کے باشندوں کو امن صرف ایک ہی صُورت میں حاصل ہو سکتا ہے یعنی وہ کسی عظیم مقصد کو اپنانے اور اس کے لیے جد و جہد کرنے کا عزم بالجزم کریں۔ امن کی دولت انہیں اسی جد و جہد کی راہ میں خود بخود ہاتھ آ جائے گی۔ ہماری اصل بد قسمتی یہ ہے کہ ہم نے کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کے لیے سعی و جہد کرنا ترک کر دیا ہے اور امن کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مقصود ٹھہرا کر اس کے حصول کے لیے براہِ راست کوششیں شروع کی ہیں مگر امن کا یہ نصب العین ہمارے لیے محض سراب ثابت ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم نے زندگی کے اصل مقصود کے بارے میں اگر اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کی تو امن کا یہ خواب، خواب ہی رہے گا کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ امن مندی کی

کوئی شے نہیں جسے سکون کے عوض خریدا جا سکے۔ پانچ یا پچاس کھرب بھی امن کے حصول کی راہ میں قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو امن اور سلامتی کو قابلِ بیع و شریٰ اشیا سمجھتے ہیں۔ رومی شہنشاہ دورِ انحطاط میں اس غلط فہمی کا شکار ہو کر امن کو خریدنے کے لیے کوشاں ہوئے مگر انہیں جلد ہی اپنی اس کوتاہ نظری کا احساس ہو گیا کیونکہ وہ اس سودے بازی میں جتنا آگے بڑھتے تھے اسی نسبت سے اقتدار کے حریصوں کی حرص تیز ہوتی چلی گئی اور وہ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے اور برباد کرنے کے درپے ہوئے۔

دُنیا میں ہمارا اثر و نفوذ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے امن کو خطرہ لاحق ہے۔ ہمارے مقابلے میں سوویت رُوس کا دائرہ اثر تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور وہ خطرات سے روز بروز محفوظ و مامون ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ملک اب اتنا مضبوط و مستحکم ہو چکا ہے کہ وہ اب اشتمالی تجربات کی روشنی میں اپنے فیصلوں کو پُورے کرۂ ارضی پر نافذ کر سکتا ہے اور جس طرح انیسویں صدی میں عظیم امریکی تجربہ لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اسی طرح آج رُوس عوام کی توجہ کا مرکز و محور بنا ہوا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اشتراکی افکار و تصورات بالکل باطل ہیں اور اس بنا پر رُوسی حکومت کبھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کو ملک میں آ کر اشتراکی تجربے کے مشاہدے کی اجازت دے۔ ہم اس حقیقت سے پُوری طرح واقف ہیں کہ جو لوگ اشتراکیت کے طلسم میں گرفتار ہو جاتے ہیں اُن کے سامنے جب حقیقت بے نقاب ہو کر آتی ہے تو وہ ششدر رہ جاتے ہیں۔

ایک مکڑا کس خوبصورتی کے ساتھ نفیس تاروں کا جالا بنتا ہے پھر دہ مکھیوں کو دعوت دے کر اس میں پھنساتا ہے۔ اشتراکیت بھی ایک "بیت عنکبوت" ہی ہے جس میں جب ایک مرتبہ لوگ فریب سے گرفتار کر لیے جاتے ہیں تو جبر واستبداد ان کا خون چوس لیتا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اشتمالیت کی قہرمانیوں کے باوجود آج ایشیا، جنوبی امریکہ، افریقہ حتیٰ کہ مغربی یورپ میں اپنے قدم آگے بڑھا رہی ہے۔

شالن نے ایک مقام پر لکھا ہے:

مارکس اور لینن کے نظریات کی قوت وتوانائی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ یہ مفکرین کسی ارتقاء پذیر معاشرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر انسانی جدوجہد کے رُخ متعین کرتے ہیں۔"

" کئی ایک غیر اشتراکی ممالک جن میں دُنیائے مسیحیت بھی شامل ہے اب فرد کے رُوحانی ارتقا کو نظر انداز کر کے سارا زور صرف معاشرے کی مادی ترقی پر دے رہے ہیں۔ چنانچہ اشتراکی اپنے دعوے کی صداقت میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ نظریہ اتنا صحیح ہے کہ اسے اشتمالیت کے دُشمن تک اب اپنانے پر مجبور ہیں اور اُنھوں نے عملاً اپنی معاشرتی زندگی کی بنیاد اشتراکیت کے اصول پر رکھی ہے۔ مغرب کے غیر اشتراکی مفکرین اس حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ ہے اشتراکیت کی ہر دلعزیزی اور ہر آن بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کا حقیقی راز۔"

• اصل مصیبت یہ ہے کہ ہم خود ابھی تک دین اور ایمان کے بارے

ہیں اور عملی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں کوئی واضح مؤقف اختیار نہیں کر سکے ہم بڑی فصیح و بلیغ زبان میں آزادی اور حریت، انسان کے بنیادی حقوق اور اس کے عزو شرف کے تذکرے کرتے ہیں لیکن ہم اس حقیقت سے بھی ناواقف نہیں کہ ہمارا ذخیرۂ الفاظ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب انسان انفرادیت پسند تھا۔ لیکن اب جب کہ انفرادیت پسندی کا یہ مسلک بالکل ناکارہ ہو گیا ہے تو یہ الفاظ بھی اپنی معنویت اور قدر و قیمت کھو چکے ہیں۔ ہم اپنے مادی کمالات یعنی اشیاء کی کثیر پیداوار، موٹر اور کاروں اور لاسلکی آلات پر انسان کے ہر آن بڑھتے ہوئے تصرف کا ذکر بڑے جوش اور ولولے سے کرتے ہیں۔ زندگی کے مادی پہلوؤں کے بارے میں ہمارا یہ انہماک اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہم روحانی اعتبار سے مفلس و قلاش ہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہماری مادی خوشحالی کو رشک اور حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں وہ اشتراکیت کے طریق کار کو بڑے شوق سے اپنا لیتے ہیں تاکہ وہ معاشرے کی مادی خوشحالی کے لیے اجتماعی طور پر جد و جہد کر سکیں۔

ہم دنیا میں اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی یلغار، اس کے ظلم و استبداد اور اس کی ریشہ دوانیوں کو روکنے سے قاصر ہیں۔ اگر اس معاملے میں ہمیں کامیابی کی امید ہو سکتی ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے اندر ایمان و ایقان کی ایسی شمعیں فروزاں کریں جن کی روشنی اور حرارت ہماری خفتہ روحانیت کو بیدار کر دے اور ہمیں اس انداز سے سرگرم عمل کریں کہ ہم روحانی

مرت اور انسانی تذلیل کے اس پُرفتن ماحول سے نجات حاصل کر سکیں۔

ہم پر سب سے بڑی اُفتاد یہ پڑی ہے کہ ہم الحاد اور مادیت کے بغیر کسی معاشرتی انصاف کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اس بات کا تو سارا دارو مدار کسی فرد پر ہے کہ وہ خوشدلی کے ساتھ اپنی رضا اور رغبت سے نوعِ بشری کے معاملے میں اپنی اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا آرزومند ہو۔

ہماری قوم کا بحیثیت قوم آزاد معاشرے پر سے اعتقاد اُٹھ گیا ہے۔

ہماری قوم نے اگرچہ اجتماعی طور پر الحاد کا مسلک اختیار نہیں کیا لیکن ہمارے دین و ایمان اور عملی زندگی کے درمیان اب بہت زیادہ بُعد و بیگانگی ہے۔

ہمارے مذہبی معتقدات اور عملی زندگی کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا مذہب ماضی کی ایک مقدس یادگار ہے جس کا موجودہ حالات کے ساتھ کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ جب ایمان اور عمل کے درمیان رشتہ منقطع ہو جائے تو ایک ایسی انقلاب انگیز اور حیات آفریں قوت کہاں پیدا ہو سکتی ہے جو نوعِ انسانی کو رُوحانیت کی دولت سے مالامال کر دے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے افکار و نظریات کی پُوری دُنیا بدل دیں۔

مارکس کے اس دعوے کا پُوری شدت کے ساتھ انکار کریں کہ اس کائنات میں مادی اشیاء اور ضروریات کو اولیت کا مقام حاصل ہے اور روحانیت ثانوی چیز ہے۔ غلامی اور استبداد اگر ناگزیر بھی ہوں تو یہ حق و صداقت کے مظہر نہیں بن سکتے۔ ہمیں بغیر کسی خوف اور تامل کے انسانی حُریت اور آزادی کے بارے میں اپنے متزلزل اعتقاد کو پھر سے بحال کرنا چاہیے۔ اس اعتقاد

کو اپنے اذہان و قلوب میں راسخ کرنا چاہیے کہ انسان کو اس کے خالق اور مالک نے صرف مادی اشیاء کی صنعت گری کے لیے پیدا نہیں کیا اور دُنیا میں اس کی زندگی کا مقصد صرف جسم کا تحفظ ہی نہیں۔ ہمیں اپنے دلوں میں اس بات کا شدید احساس پیدا کرنا چاہیے کہ انسان جہاں کہیں بھی فکری، رُوحانی، اقتصادی اور سیاسی استبداد کے چنگل میں گرفتار ہے اس سے اُسے نجات حاصل ہونی چاہیے۔ یہ آزادی ہی اس کی مادی فلاح و بہبود کا صحیح اور حقیقی ذریعہ بن سکتی ہے۔

مگر اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ معاشرے کی آزادی کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ہر فرد مادر پدر آزاد ہو کر اپنے نفس کی پیروی میں جو چاہے کرتا پھرے اور کوئی اُسے ٹوکنے والا نہ ہو۔ یہ آزادی کی نہایت غلط تصویر ہے۔ آزاد معاشرے کا مطلب یہ ہے کہ افراد نظم و ضبط کے پابند ہوں مگر یہ نظم و ضبط قانونی جکڑ بندیوں سے پیدا نہ ہو بلکہ رب العالمین کی ربوبیت پر ایمان اور نوعِ بشری کے ساتھ محبت سے پیدا ہو اور انسان کو اخوت کے ایسے نازک اور لطیف رشتوں میں باندھ دے کہ ہر فرد دُوسرے کا دمساز اور فدائی بن جائے۔"

مسٹر ڈلس آخر میں کہتے ہیں:

"اصوات امریکہ" کی تعداد کا بڑھانا یا انہیں اور بلند کرنا اس وقت تک بالکل بیکار ہے جب تک کہ ہمارے پاس دینے کے لیے کوئی پیغام نہ ہو۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نئے پیغام کی نشر و اشاعت قوم کے روحانی

اور اخلاقی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو سنجیدگی سے قبول کر لیں تو اشتراکی رُوس کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل سے نہایت پُرامن طریقوں سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

بہت سے واعظ اور معلمینِ اخلاق اس بات کا رونا روتے ہیں کہ سائنسی ترقی سے ایذا رسانیوں کے نئے نئے طریقے معلوم ہو گئے ہیں۔ علم کے نئے اُفق اور اکتشافات کے نئے میدان بذاتِ خود انسانی مذموم نہیں البتہ مادہ پرستی کی عملداری میں مادی قوت کی فراوانی انسانی خطرناک اور تشویش انگیز ہے اگر یہ رُوحانیت کے تسلط میں رہے تو اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ سائنسی علوم نوعِ بشری کو آج یہ مادی قوت اس بنا پر عذاب دکھائی دے رہی ہے کہ دُنیا کی رُوحانی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ ایمان اور عمل کے درمیان کوئی مضبوط رشتہ قائم کرنے میں سخت ناکام ثابت ہُوئے ہیں؛ چنانچہ انسانیت کی فلاح کا انحصار اس بات پر نہیں کہ علوم و فنون اور سائنس کے نشوونما کو روک دیا جائے، بلکہ اس بات پر رُوحانیت بڑی سُرعت کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کی زمام تھام لے اور انہیں اپنی رہنمائی میں صحیح رُخ پر آگے بڑھا لے جائے۔"

امریکہ کے صدر روسلٹ نے اپنی وفات سے چند ہفتے پیشتر اشتراکیت کے انقلابی عقائد اور عزائم پر تبصرہ کرتے ہُوئے کہا تھا:

"ہماری تہذیب اگر رُوحانی اعتبار سے ترقی نہیں کرتی، تو تنہا مادی ذرائع زیادہ دیر تک اس کی بقا کے ضامن نہیں بن سکتے۔"

" یہ وقت کا ایک کھلا چیلنج ہے جو ہمارے کلیساؤں، ہماری سیاسی تنظیموں، ہمارے امراء اور ہر اس شخص کو دیا جاتا ہے جس کے دل میں خدا کا خوف اور وطن کی محبت ہے۔"

مسٹر ڈلس کی یہ صدائے خوف و خطر بھی ڈاکٹر کیرل کی آہ و فغاں کی طرح اتنی آسانی سے انسانی قلوب پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور نہ اس چیلنج سے انسانیت کے کرب والم کا مداوا ہو سکتا ہے جو مسٹر ڈلس نے کلیساؤں، سیاسی تنظیموں، سرمایہ داروں اور ہر اس شخص کو دیا ہے جس کے دل میں خوفِ خدا اور وطن کی محبت ہے۔ انسانیت کو موجودہ کرب و الم سے نجات دلانے کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ دقت طلب ہے، جتنا کہ اُسے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیونکہ جب سے پولوس، قسطنطین، کلیسا، مذہبی مجالس اور اہل کلیسا نے مسیحیت کا حلیہ بگاڑ دیا ہے، کلیساؤں میں وہ مسیحیت نہیں رہی جو انسانی زندگی کی ایک جامع اساس بننے کے لیے موزوں و مناسب ہو سکے۔

مسٹر ڈلس نے نصرانیت کے جن بچے کھچے آثار و اعتقادات کا ذکر کیا ہے انہیں امریکہ کی موجودہ مادی تہذیب برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تہذیب جو ابتدائی طور پر بے لگام انفرادیت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی، سُود اور بٹہ داری کے سرمایہ دارانہ نظام میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

میرا تو یہ خیال نہیں کہ مسٹر ڈلس جو تہذیب حاضر کے خطرات کا رونا رو رہے ہیں، انہوں نے کبھی امریکہ کے اجتماعی نظام کو نصرانیت کے بچے کھچے آثار و اعتقادات کے مطابق بنانے کے متعلق سوچا بھی ہو۔ کیونکہ موجودہ مسخ شدہ نصرانیت بھی سب سے پہلے اس بات کی مقتضی ہے کہ اس سودی نظام کو بالکل کالعدم قرار دیا جائے جس پر عہدِ

حاضر کی عمارت قائم ہے اور جس نے نوعِ بشری کی حرماں نصیبیوں اور اس مادی تہذیب کی تباہ کاریوں نے خوب خوب اضافہ کیا ہے اور جس کو نصرانیت میں بھی اُسی طرح حرام کہا گیا ہے جس طرح کہ دُوسرے آسمانی مذاہب میں۔

یُوں محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر ڈلس نصرانیت کی ایک ایسی غیر واضح سی صُورت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو اُن کے اقتصادی نظام میں دخل انداز نہ ہو اور جسے وہ اشتمالیت کی بلائے درماں سے نمٹنے میں اپنے دُوسرے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔

اگر اہلِ مغرب حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کو فی الحقیقت دینی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے سنجیدگی سے خواہش مند بھی ہوں تو بھی اس راہ میں بہت سے موانع حائل ہیں۔ مسیحی تعلیمات اور اہلِ یورپ کی عملی زندگی کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے کہ اُسے آسانی کے ساتھ پاٹا نہیں جا سکتا۔ اس اختلاف کے پیچھے پانچ صدیوں پر پھیلی ہوئی آویزش کی ایک تلخ داستان بھی ہے۔

مسٹر ڈلس نے انسانیت کے رُوحانی احیاء کے لیے اہلِ کلیسا اور رُوحانی پیشواؤں پر وہ ذمہ داری ڈالی ہے جو اُن کے بس میں نہیں۔ وہ آج جس دین کے علمبردار ہیں وہ صحیح مسیحیت نہیں بلکہ اس کی ایک بگڑی ہُوئی شکل ہے جس کی تہ میں اہلِ کلیسا اور اہلِ دُنیا کی باہمی سر پھٹول کی تلخیاں موجود ہیں اور جس کی تاریخ اُن عبرت انگیز واقعات سے بھری پڑی ہے کہ اہلِ مغرب نے کس مجرمانہ طریقے سے مسیحیت کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کی عمارت یعنی فکر و شعور اور جذبہ و احساس کو خالص الحاد کی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔

میں پُورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مسٹر ڈلس نے اہلِ کلیسا کو اس ذمہ داری کا مکلف ٹھہرایا ہے جس سے عہدہ برآ ہونا اُن کے بس کا روگ نہیں۔ وہ آپ سے یہ مطالبہ کرتا ہے

کہ اس مسخ شدہ دین سے ایک ایسا نظام زندگی اخذ کریں جو ایمان اور عمل کے درمیان انفرادی اور اجتماعی مفادات کے درمیان، جسمانی تقاضوں اور رُوح کے مطالبات کے درمیان، سائنسی ترقی اور اس ترقی پر رُوحانی تسلط کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ نیز اجتماعی زندگی نشو و ارتقاء پر ایمان و ایقان کا تسلط قائم کرے۔ الغرض اس نظام زندگی میں مذہب کا ایسا جامع تصور پیش کیا جائے جس میں انسان کے اپنے معتقدات اور اس کے اعمال و کردار کے درمیان کوئی بُعد و بیگانگی نہ رہے اور پھر وہ پُورے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکے کہ عوام کے اندر عرصے بسے یہ خیالات کہ الحاد اور مادیت کے بغیر معاشرتی عدل کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا یا مادی اشیا، کہ اس دُنیا میں اولیت کا مقام حاصل ہے یا غلامی اور جبر و استبداد کے ذریعے ہی کثیر پیداوار ممکن ہے یا عقلی، رُوحانی اور اقتصادی آزادی کو سلب کیے بغیر پیداوار نہیں بڑھ سکتی، سب مذموم اوہام اور باطل نظریات ہیں۔ پھر دین کے اس جامع تصور کے مطابق مذہب کو سائنسی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے یا دینداری کو سائنسی علوم کے حصول کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ انسان کو فی الحقیقت دین کے اس ہمہ گیر اور حیات آفریں تصور کی ضرورت ہے جس میں "عبادت" کا مفہوم اتنا جامع ہو کہ "کام" بھی عبادت کی ایک صُورت بن جائے۔

زندگی کا ایک جامع نظام مسیحیت کی موجودہ مسخ شُدہ تعلیمات اور اس کی تاریخ کے کھنڈرات میں کہاں مِل سکتا جب کہ مسیحیت اور حیاتِ انسانی کے درمیان عموماً اور مسیحیت اور موجودہ مادی تہذیب کے درمیان خصوصاً ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی ہے۔ زندگی میں ایسا انقلاب انگیز نظام پیش کرنے والے کوئی دُوسرے ہی لوگ ہیں اور وہ دین جس میں زندگی کا یہ تصور اپنی مکمل صُورت میں موجود ہے۔ یہ وہ نہیں ہے جسے آج اہلِ مغرب اپنا

دین کہتے ہیں۔

مسٹر ڈلس اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے دینی قوتوں کو استعمال کرنے کے آرزو مند نظر آتے ہیں مگر اشتمالیت اور موجودہ مغربی نظاموں کی باہمی آویزش میں دینِ مسیحیت کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اشتمالیت اور دُوسرے مغربی نظام سب کے سب مادی نظام ہیں۔ مسیحیت ایسی صُورتِ حال میں کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتی۔ وہ انسانیت کا مختلف خطرات سے کس طرح دفاع کر سکتی ہے جب کہ انسان نے خود ہی اُسے ایک رہنما قوت بنانے کے بجائے اپنی عملی زندگی سے یکسر خارج کر دیا ہے۔

" اللہ کے دین " کو یہ حیثیت کبھی گوارا نہیں کہ وہ غلامی کا پٹہ پہنے اپنے " آقاؤں " کے حضور دست بستہ کھڑا ہو اور وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ وہ اسے اپنے دربار سے نکال دیں تو وہ اُن کے سامنے زمین بوسی کرتے ہُوئے نکل جائے اور ایک عاجز غلام بن کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر مالک کے اشارے کا انتظار کرے اور جب اس کے مالک اُسے خدمت کے لیے بلائیں تو وہ پھر زمین بوسی کے بعد ان کے حضور میں پیش ہو کر اور جُھک کر یوں عرض کرے :

" حاضر ہوں اے میرے آقا ! تیری خدمت اور چاکری کے لیے "

اللہ کے دین کے ساتھ اُن نام نہاد دین داروں (یعنی اہلِ کلیسا) نے یہی معاملہ کیا تھا۔

" اللہ کے دین " کو اس کے سوا کچھ قبول نہیں کہ وہ آقا، نگراں، طاقتور انسانی زندگی میں تصرف کا پُورا پُورا اختیار رکھنے والا، غالب اور معزز بن کر رہے۔ حاکم بن کر رہے نہ کہ محکوم قائد بن کر رہے نہ کہ تابع مہمل۔ وہ لوگوں کو اشتمالیت اور غیر اشتمالیت سے اسی وقت بچا

سکتا ہے کہ اُن کی ساری زندگی اس کے زیرِ اطاعت ہو۔ وہ اُن کی زندگی کے سارے شعبوں کی تنظیم اپنے ضابطہ وقانون کے مطابق کرے اور لوگ اُسے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں برضا و رغبت ثالث تسلیم کریں:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (النساء: ٦٥)	نہیں اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کریں۔ (۴ : ۶۵)

جس دن اللہ کے دین کو حاکم تسلیم کر لیا جائے گا۔

اسی دن یہ ایک صاحبِ تدبر آقا نہ کہ ایک ذلیل غلام کا کردار ادا کرے گا۔ اسی دن انسانیت کی اس بدبختی اور تاریکی کو جنم دینے والی تفریقِ دین و دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی دن وہ "نجات دہندہ" آئے گا جس کی مختلف خوبیاں اور نشانیاں گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی ہیں۔

یہ سب لوگوں کا منتظر نجات دہندہ وہ دین ہے جسے اسلام کہتے ہیں۔

نجات دہندہ کی تلاش

مضطرب دلوں اور مضمحل ہونٹوں سے وقتاً فوقتاً ہر جگہ ایسی بہت سی آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی راہِ نجات اور نجات دہندہ کی تلاش کے لیے دہائی دے رہی ہیں ۔ انہی آوازوں میں نجات دہندہ کی علامات اور صفات کا تصور بھی ملتا ہے اور یہ علامات وصفات صرف اس دین یعنی اسلام پر ہی صادق آتی ہیں ۔

یہ حقیقت اس کتاب کے پہلے باب میں بھی بیان کی گئی ہے اور اس باب سے پہلے باب "دلدوز نالے" میں بھی جس میں ڈاکٹر کیرل اور مسٹر ڈلس کے اقوال کی روشنی میں اس حقیقت کی مکمل تشریح و توضیح موجود ہے ۔ اگرچہ اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اُس حقیقی نجات دہندہ کا واضح طور پر ذکر نہیں کیا جو مذکورہ علامات وصفات کا مصداق ہے ۔

ڈاکٹر کیرل "صنعتی دین" اور ٹیکنالوجی کے علاوہ کوئی نظامِ زندگی چاہتے ہیں ۔ وہ ایک ایسے نظامِ زندگی کے آرزومند ہیں جس میں انسان اور اس کی فلاح و بہبود ہی ہر چیز کا معیار قرار پائے اور جو انسان کو اس کے اپنے ہی جہان میں اجنبی بنا کر نہ رکھ دے اور جو اس کو اس بات پر مجبور نہ کر دے کہ وہ اپنے خصائص اور اقدار کو بالکل نظر انداز کر دے ۔

وہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں صنعتی زندگی کی تنظیم کے وقت اس بات کو بالکل

نظر انداز نہ کیا جائے کہ کارخانوں کا مزدوروں کی جسمانی اور عقلی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے اور جس کا ڈھانچہ اس اصول پر مرتب نہ کیا جائے کہ کم سے کم مصارف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے۔ حتیٰ کہ کوئی ایک فرد یا گروہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر سکے۔ وہ ایک ایسے نظام کے خواہش مند ہیں جو ایسا ماحول پیدا نہ کر دے جو ہمارے وجود اور قیام کے لیے بالکل غیر موزوں ہو اور جو ہمیں اخلاقی اور عقلی اعتبار سے پست نہ کر دے اور ہمارے فطری، جمالی اور دینی ذوق پر قدغن لگا کر اس کی نشوونما کو بالکل معطل نہ کر دے اُور تنگ ذہن اشخاص کو جنم نہ دے۔

ایک ایسا نظام ان کا منتہائے مقصود ہے جس میں انسان کی انفرادیت کو تسلیم کیا جائے مگر اس بات کو بھی فراموش نہ کیا جائے کہ فرد کو اجتماعی زندگی کی بھی ضرورت ہے اور جس میں ہماری تربیت اس طرح نہ کی جائے کہ ہم بھیڑ بکریوں کے گلوں کی طرح رہیں سہیں ایسا نظام جس میں مَرد اور عورت دونوں کی الگ الگ حیثیتوں کو تسلیم کیا جائے کیونکہ دونوں صنفوں کے درمیان تفاوت کو نظر انداز کرنا نہایت درجہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسا نظام کہ جو انسانی زندگی کو بالکل بے قید نہ چھوڑ دے کہ مارکس، لینن اور فرائڈ کے خیالات اور بعض دوسرے لوگوں کی خواہشات، نظریات اور ذاتی میلانات اُسے جس طرح چاہیں خراب کرتے پھریں۔

ایسا نظام جو قوانینِ فطرت سے تجاوز نہ کرے اور انسان کی اس بات پر حوصلہ افزائی نہ کرے کہ وہ ان مقامات پر قدم رکھنے کی کوشش کرے جو اس کے اخلاق کے لیے تباہ کن ہوں اور یہ نظام انسانی وجود کے حیاتیاتی حقائق سے متصادم نہ ہو۔

اَور ایسا نظام کہ جس میں انسان مادیت کی ناکامی کو آڑ بنا کر اُس "سلبی روحانیت" کی طرف نہ جھک جائے جو یورپ کے نظامِ رہبانیت کا طرۂ امتیاز تھی اور نہ وہ فرائڈ کی گمراہ کن

نفسیات کی طرف رجوع کرے۔

مگر ڈاکٹر کیرل اس نظام کو چاہتے ہیں کہ "انسانیات" میں جس کی مندرجہ بالا صفات ہیں۔ مگر انسانیات یا علم الانسان میں یہ بات بھی ایک ثابت شدہ امر ہے کہ عقلِ انسانی فطرتاً انسان کے علم و عرفان سے قاصر ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ مسٹر ڈلس کس نظام کے آرزو مند ہیں ؟

وہ ایک ایسے نظام کے آرزو مند ہیں جو سوسائٹی کی روحانی زندگی کو ثانوی حیثیت دے کر اس کی مادی زندگی کی ترقی کو اولین حیثیت نہ دے دے اور نہ ایمان کو حیاتِ انسانی میں ثانوی حیثیت دے۔

ایسا نظام جو ایمان اور انسان کی عملی سرگرمیوں کے تعلق کے بارے میں کوئی پیچیدہ مؤقف نہ رکھتا ہو۔

ایسا نظام جو امریکی تجربہ کی طرح بے قید انفرادیت پر مبنی نہ ہو۔ کیونکہ اس نوعیت کی بے قید انفرادیت اجتماعی زندگی کی بے وقت موت کے مترادف ہے۔

ایسا نظام کہ جو اس بات میں قابلِ افسوس حد تک ناکام نہ ہو کہ الحاد اور مادیت کو اپنائے بغیر بھی اجتماعی عدل کا حصول ممکن ہے۔

ایسا نظام جو دین اور دین کی عملی صورت کے درمیان فرق نہ کرے اور ایمان و عمل کے رشتے کو منقطع نہ کر دے اور جو اس زعم باطل سے مبرا ہو کہ دین جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

ایسا نظام جو مادی اشیاء کو اولیت کا مقام اور روح کو ثانوی حیثیت دینا کسی حال میں بھی گوارا نہ کرے اور جس میں غلامی اور استبداد کو۔ خواہ یہ بعض استثنائی حالات میں ہو۔ ہمیشہ

نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ جس میں انسان کی حیثیت پیدائشِ دولت میں محض آلۂ کار کی نہ ہو اور جس میں انسان کی روحانیت اور آزادیٔ فکر کو سلب کر کے محض اس کی معاشی خوش حالی کا انتظام نہ کیا جائے۔

ایسا نظام جس کے زیرِ سایہ معاشرے میں افراد آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں اور اُس رشتۂ اخوت سے بندھے ہُوئے ہوں جو انہیں بے لگام انفرادیت اور جابر و مستبد اجتماعیت دونوں سے محفوظ رکھ سکے۔

ایسا نظام جس میں رُوحِ ایمانی کو علمی انکشافات اور سائنسی معلومات پر نگران و نگہبان کی حیثیت حاصل ہو اور علمی اور سائنسی ترقی کو اس بنا پر رد کرنے کا خواہاں نہ ہو کہ وہ مذہب اور ایمان کے لیے خطرہ ہے۔

ایسا نظام جس میں عقیدے اور عمل کے باہمی تعلق کو واضح کیا جائے اور جس میں عبادت کا اتنا ہمہ گیر تصور موجود ہو کہ انسان کی پُوری زندگی اس کی حدود میں آجاتی ہو۔

مسٹر ڈلس امریکہ کے پادریوں سے، اپنے مُلک کے رُوحانی پیشواؤں سے اِس نظام کے طالب ہیں، درآں حالیکہ وہ مغرب میں کلیسا کی تاریخ اور اہلِ مغرب کی مذہب اور اجتماعی زندگی میں تفریق اور اس کے تلخ نتائج کو بخوبی جانتے ہیں۔

لیکن یہ واضح رہے کہ کوئی "علم الانسان" ڈاکٹر کیرل کی صدائے خوف و خطر پر لبیک نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی کلیسا اور مذہبی پیشوا مسٹر ڈلس کی چیخ پکار کا جواب دے سکتے ہیں۔

نجات دہندہ کی جو صفات مذکورہ بالا دونوں مفکروں کو مطلوب ہیں وہ صرف دینِ اسلام ہی میں مِل سکتی ہیں اور زندگی کے جس نظام کا اُنہوں نے ذکر کیا ہے وہ صرف اسلام کے پاس ہی ہے۔ دُوسرے کوئی مذاہب اور نظریات جن سے آج تک نوعِ بشری آشنا

ہوئی ہے۔ ایسا نظامِ زندگی پیش نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر کیرل اپنی علمی برتری اور وسعتِ نظر کے باوجود اس نجات دہندہ کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ سفید فام آدمی ہیں اور سفید فام تو صرف سفید فام نسل کی برتری اور عزو شرف ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا سکتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی کتاب کی تالیف گوری نسل کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے کی ہے۔

اسلام چونکہ کسی سفید نسل سے تعلق رکھنے والے شخص کی تخلیق نہیں، اس لیے یہ مغربی عالم اسے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھ سکتا۔

اسی طرح مسٹر ڈلس بھی اس نجات دہندہ کو التفات کا مستحق نہیں سمجھتا کیونکہ وہ تو سفید فام آدمی ہونے کی حیثیت سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ وہ اس دینِ حق سے زبردست پرخاش رکھتا ہے اور یہ وہ شخص ہے جس نے دورِ جدید میں اسلام کے خلاف معرکہ آرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ وہ ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ دینِ حق کا دُنیا سے یکسر استیصال ہو جائے اور اس کی جگہ انسان کے خود ساختہ تصورات و اقدار کا تسلط قائم ہو۔

• مگر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر کوئی دین دُنیا کے موجودہ اضطراب و ہیجان کو سکون و ثبات میں بدل سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے اور یہی وہ "نسخہ" ہے جو نوعِ انسان کی جملہ بیماریوں اور دکھوں کے لیے شفا بخش ثابت ہو سکتا ہے۔

اہلِ یورپ اور باقی دُنیا کے باشندے مذہب اور اجتماعی زندگی کی تفریق سے پہلے اور بعد میں مذہب کی جس صورت سے آشنا ہوئے ہیں، اسلام اس سے الگ اپنی نوعیت کا ایک جدید نظامِ زندگی ہے۔ یہ نظام ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ موجودہ زندگی اور حالات کے لیے صرف ایک متوازن نظام نہیں بلکہ انسان کے معتقدات اور اس کے تصورات و

افکار کے لیے بھی ایک صحیح اور صالح نظامِ حیات ہے۔ یہ انسان کے اعمال و کردار کے لیے ایک اسلُوب ہے۔ لہٰذا یہی انسانیت کی تعمیرِ نَو کی ذمہ داری سے بطریقِ احسن عُہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

انسانی سوسائٹی صحیح راستے سے ہٹ چکی ہے۔ اس وقت سے نہیں جب کہ انسان نے بے جان مادے کے علوم کی طرف توجہ مبذول کر دی تھی اور انسانی علوم کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، نہ اس وقت سے جب کہ انسان پر مشینوں کی حکومت ہو گئی تھی جو انسانی فطرت کے بالکل برعکس تھی اور نہ اس وقت سے جب کہ انسان نے اپنے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظاموں کو اُن مفاد پرستوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا جنھوں نے ان نظاموں کو ایسے رُخ پر ڈال دیا کہ انسان کی فلاح و بہبود اور اس کی حقیقی ضروریات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جیسا کہ ڈاکٹر کیرل کا خیال ہے۔ یہ سب لغزشیں اور کوتاہیاں بلاشبہ بڑی عبرتناک ہیں مگر مذہب سے انحراف کی تاریخ میں ان کی حیثیت بعد کے مراحل کی ہے۔

انسانی سوسائٹی نے تو اُسی دن اپنا صحیح راستہ کھو دیا جب کہ مذہب اور اجتماعی زندگی کی تفریق سے پیدا شدہ بدترین حالات نے اور احیائے علوم، روشن خیالی اور صنعتی ترقی کے مختلف اَدوار نے اس کو یعنی انسانی سوسائٹی کو صرف کلیسا کے بتائے ہُوئے معتقدات سے نہیں بلکہ خُدا کے عطا کردہ نظامِ زندگی سے رُوگردانی پر مجبُور کر دیا۔ بالآخر الٰہی تصورِ اعتقادی اور اجتماعی زندگی کی تفریق پُوری طرح معرضِ وجود میں آ گئی۔

ڈاکٹر کیرل کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ صنعتی علوم اور انسانی علوم کے درمیان پیوند لگا کر انسان کے لیے فوز و فلاح کا راستہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسانوں کی زندگی کے دھارے کو "علم" کی طرف نہیں بلکہ خالقِ کائنات کے بارے میں گہرے ایقان و ایمان کی طرف موڑنے کی ضرورت ہے۔ انسان بحیثیت انسان ایمان کے اس بُنیادی تقاضے سے کبھی بے نیاز

نہیں ہو سکتا۔

میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر کیرل جو صنعتی تہذیب کو بدلنے اور انسانی ترقی کے لیے ایک نئے نظام کی ضرورت کا تذکرہ بڑی شدومد سے کرتے ہیں۔ ایک جست لگا کر سائنس کے آہنی قفس سے نکل آئیں گے مگر وہ کوئی بڑی جست نہ لگا سکے اور قفس کے اندر ہی سے اُن خطرات کی دہائی دیتے رہے جو تباہی کی راہ پر گامزن بے چاری انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں۔

حیاتِ انسانی جو مختلف خطرات کی زد میں ہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک کامل جست لگا کر اپنی اس فطرت کی طرف لوٹ آئے، جس پر اللہ جل شانہٗ نے اُسے پیدا کیا ہے اور ناممکن ہے کہ وہ اُن اصولوں، نظریات اور وسائل کو اپنا کر اپنی فطرت کی طرف لوٹ سکے جن کا سرچشمہ وہ تمدنی تصور ہے جس میں خطرات پوشیدہ ہیں اور جو اول روز ہی سے خلافِ فطرت اصولوں پر قائم ہے۔ آج ایک نیا حیات آفریں اور انقلاب انگیز تصورِ حیات ناگزیر ہو گیا ہے جو انسان کی اجتماعی زندگی کی اساس اور بنیاد کو بدل کر رکھ دے اور اس کو ایک ایسی بنیاد پر استوار کرے جو انسان کی فطرتِ تکوینی اور حقیقتِ کائنات سے ہم آہنگ ہو۔ انسانی فطرت اور کائنات کی حقیقت کو اُس طرح دیکھے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں نہ جیسا کہ مغربی تہذیب کی کارگاہوں میں بنائی ہوئی رنگ رنگ کی فکری عینکیں دکھاتی ہیں۔

انسان کے بارے میں ہمارا محدود اور قلیل علم یا ہماری مطلق لاعلمی جیسا کہ ڈاکٹر کیرل صاحب کہتے ہیں، ہمیں بالکل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہمارے ہاتھ میں انسانی زندگی کے نظام کی بنیادی منصوبہ بندی ہو اور اگر اس چھوٹے سے مادی نظام (یعنی جسمِ انسانی یا وجودِ بشری) کے بارے میں علم یا جہالت کا یہ حدود اربعہ ہے تو اس نظام کا مالک تو ہمیں اس میں کوئی اصلاح و ترمیم بھی نہیں کرنے دیتا چہ جائیکہ اس کی ترکیب و تشکیل میں

دخل اندازی کرنے دے لیکن ہم بایں جہالت و لاعلمی انسان کے لیے ایک نظام وضع کرنے چلے ہیں، اس انسان کے لیے جو اس جہانِ رنگ و بُو میں سب سے گراں قدر وجود ہے اور ہم اس بات سے بالکل بے پروا ہیں کہ ہمارا اپنا وضع کردہ یہ نظام انسان کو کن کن مصائب و شدائد سے دوچار کر دے گا۔

ہم انسانی عقل کے بارے میں ایک بہت بڑے فریب کا شکار ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل نے مادی دُنیا میں بعض ایسی چیزیں پیدا کر دکھائی ہیں جو حیرت انگیز ہیں۔ ہم اس وہم میں پڑ گئے کہ جس عقل نے ہوائی جہاز اور راکٹ ایجاد کیے ہیں، ذرے کو توڑ کر ایٹم بم بنالیا ہے اور قوانینِ طبیعی کی معرفت حاصل کر لی ہے۔ وہی عقل اس بات کے لیے موزوں تر ہے کہ ہم حیاتِ انسانی کے نظام کو وضع کرنے کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد کر دیں اور وہی تصورات و اعتقادات کے قواعد اور اخلاق و کردار کی بنیادیں وضع کرے، مگر ہم عقل کو یہ ذمہ داریاں سونپتے ہوئے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ جب وہ مادی دُنیا میں کام کرتی ہے تو ایک ایسی دُنیا میں کام کرتی ہے جس کو جاننا اس کے لیے ممکن ہے کیونکہ وہ اس کے قوانین کو سمجھ سکتی ہے مگر جب وہ "انسانی دُنیا" میں کام کرتی ہے تو وہ زیادہ تر ظن و تخمین سے کام لیتی ہے کیونکہ وہ اس دُنیا کی پیچیدہ حقیقتوں کے ادراک سے عاری ہے۔

تعجب ہے کہ جو شخص اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ عقلِ انسانی بڑی کوتاہ رَس ہے وہ وہی مغربی مفکر ہے جو "علم الانسان" کے ذریعے فلاحِ بشری کا طلب گار ہے۔

اس وہم کے مقابلے میں ایک اور عظیم تر وہم یہ بھی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسانی زندگی پر ایمان و ایقان کے تسلط کا مطلب یہ ہے کہ مادی علوم اور اس کے تمدنی ثمرات و نتائج کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ باوجودیکہ یہ ایک عظیم تر وہم ہے۔ یہ بالکل سادہ

بلکہ مضحکہ خیز وہم ہے۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ اس کی موید ہے۔ حتیٰ کہ ایچ جی ویلس نے کتاب "جنگ یا امن" کے ایک طویل باب "ہماری روحانی ضروریات" (جس کے چند اقتباسات گزشتہ باب میں پیش کیے گئے ہیں) میں بھی اس مضحکہ خیز وہم کی تائید کی ہے۔

صیح خدائی نظام زندگی میں ایمان و ایقان کے تسلط کا معاملہ یوں نہیں۔ اللہ کا دین سائنس اور تہذیب و تمدن کی جگہ نہیں لینا چاہتا اور نہ وہ سائنس اور تہذیب و تمدن کا مخالف ہے۔ وہ تو علم و تمدن کے لیے ایک چوکھٹا اور ایک محور ہے اور ایک ایسا علمی و تمدنی نظام ہے جو اپنے چوکھٹے کے حدود کے اندر اور اپنے محور کے گرد سرگرم عمل ہے اور زندگی کے جملہ امور پر حاوی ہے۔

اسلام بذاتِ خود اس بات کا اعلان ہے کہ عقلِ انسانی مادی کائنات اور اس کے قوانین اور اس کی مختلف قوتوں اور پوشیدہ خزانوں کی تلاش و تفحص کے لیے بالکل آزاد ہے اور اس بات کی دعوتِ عام ہے کہ یہ عقل اللہ کے اس وسیع و عریض ملک میں کارہائے نمایاں انجام دے۔ اسلامی تصوریات میں خالق اور مخلوق کے تعلق اور اس کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے حدود و افکار و اعمال کے متعلق جو حقائق موجود ہیں یہ ان میں سے ایک ہے، اس لیے اسلام کے زیرِ سایہ جو تہذیب مع اپنی تخلیقی و اختراعی اقدار کے پروان چڑھتی ہے وہ ایجاد و اختراع کے وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی دیتی ہے ان وسائل و ذرائع میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، مگر اسلام ان تخلیقی و اختراعی اقدار کو نشوونما کا موقع دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کو پوری شدت سے ملحوظ رکھتا ہے کہ یہ مادی ترقی انسانی فطرت اور اس کے گراں قدر انسانی خصائص سے متصادم نہ ہو اور نہ اس کو بالکل برباد

کر دینے اور دبا دینے کا باعث ہو۔ جیسا کہ ڈاکٹر کیرل کے بقول موجودہ مغربی تہذیب کرتی ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے بالکل مبنی بر حقیقت ایک تجرباتی اسلوبِ زندگی کی داغ بیل ڈالی ہے جو اُندلس کی یُونیورسٹیوں سے یُورپ میں منتقل ہوا جسے رَوجر بیکن اور فرانسس بیکن نے اپنایا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ انہیں ہی اس تجرباتی اسلوبِ زندگی کا مُوجد کہا جانے لگا۔ رابرٹ بریفالٹ اور بعض دُوسرے مغربی مصنفین نے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

اسلام حیاتِ بشری کی ابتدائی اور بُنیادی منصُوبہ بندی اس "علم" کے سُپرد کرتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل اور جامع ہے جو جہالت، نقص اور خواہشِ نفسانی سے مُبرا و منزہ ہے یعنی خدا کے علم کے سُپرد کرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہی دُنیا و مافیہا کو پیدا کیا ہے کائنات کے قوانین وضع کیے ہیں۔ انسان کی تخلیق کی ہے اور اس کو اس وسیع و عریض مادی کائنات میں کام کرنے کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ صرف وہی وجودِ انسانی اور فطرتِ کائنات کے مختلف حقائق کو جانتا ہے۔ صرف وہی اس بات کی قُدرت رکھتا ہے کہ انسان کے لیے کوئی ایسا نظامِ زندگی بنائے جو اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بلکہ عالمِ کون و مکان میں اُس کی زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو۔ خُدا کے بنائے ہُوئے اس نظامِ حیات میں اہلِ کلیسا کی طرح عقلِ انسانی کو بالکل معطل کر کے نہیں رکھ دیا گیا۔ عقل تو انسان کے لیے باری تعالیٰ کا ایک ایسا قابلِ قدر عطیہ ہے جس سے کام لے کر وہ سرگرمِ عمل ہوتا اور ایجاد و اختراع کرتا ہے۔ بایں ہمہ اسلام نے عقلِ انسانی کے گرد خوفِ خدا کی ایک ایسی باڑھ لگا دی ہے جو اُسے خواہشِ نفسانی، جلد بازی، بے راہ روی اور ذلت و پستی سے

بچاتی ہے۔ اس نے عقلِ انسانی کے لیے ایک ایسا راستہ متعین کر دیا ہے جو بالکل سیدھا، ضلالت و گمراہی سے یکسر محفوظ اور اس کی آزادی کا محافظ ہے۔

انسان اور کائنات کے خالق و مالک نے حیاتِ انسانی کے لیے جو ضابطہ تجویز فرمایا ہے اس میں بے جان مادہ کو ذی رُوح انسان کے تابع رکھا ہے۔ اسی ضابطے کے تحت انسان اس کائنات میں قابلِ عزت و تکریم ہے بشرطیکہ وہ خالق کی بندگی کا احساس رکھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کرے کہ وہ اس وسیع و عریض ملکِ خدا میں اس کا خلیفہ اور نائب ہے۔

مذکورہ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسٹر ڈلس جس نظامِ زندگی کے لیے چیخ پکار کر رہے ہیں وہ یہی "اسلام" ہے مگر افسوس کہ وہ سفید نسل کی برتری کے تعصب کی بنا پر اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اسلام ہی وہ نظامِ زندگی ہے جو انسانیت کو بقول ڈاکٹر کیرل کے صنعتی تہذیب کی بربریت سے اور بقول مسٹر ڈلس کے اشتمالیت کے دامِ ہم رنگِ زمین سے بچانے کے لیے آگے بڑھ سکتا ہے اور ہم اسلامی نظام کے علمبردار ہی اس نظام کو انسانی فوز و فلاح کے لیے ایک مجرب نسخہ کے طور پر پیش کرنے کی ذمہ داری سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

موجودہ صنعتی تہذیب جو آج نوعِ بشری پر چھائی ہوئی ہے وہ حیاتِ انسانی کی ارفع و اعلیٰ اقدار سے برسرِ پیکار ہے اور اس نے انسانیت کے زاویۂ عالیہ کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی اکتشافات و ایجادات نے انسانی زندگی میں کئی ایک آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ مگر یہی آسانیاں جیسا کہ ڈاکٹر کیرل نے اپنی کتاب "انسان نامعلوم" (Man the Unknown) میں کئی مقامات پر اعتراف کیا ہے، خود انسان کے مادی وجود

کے لیے بھی نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔

اسلام کائنات اور اس میں انسان کے کردار کی حقیقت اور اپنے تجرباتی نظام حیات کے مزاج و فطرت کا جو تصور رکھتا ہے اس کے مطابق وہ ہرگز ان صنعتی کارگاہوں کو تباہ و برباد نہیں کر دے گا اور نہ وہ اُن آسانیوں کو ناجائز قرار دے گا جو موجودہ صنعتی ترقی نے انسان کے لیے پیدا کی ہیں۔ بلکہ وہ موجودہ تہذیب و تمدن اور اس کی اقدار کے بارے میں بُنیادی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرے گا اور اس کے کمالات کی صحیح صحیح قدر و قیمت متعین کرے گا۔ اس طرح کہ رُوحِ انسانی کو دولتِ ایمان سے سرفراز فرما کر موجودہ سائنسی اور صنعتی ترقی کو اس کے تابع کر دے گا۔ نہ کہ سائنسی اور صنعتی ترقی کو انسان کے افکار و نظریات اور تعلقات و حالات پر مسلط کر دے گا۔

اسلام انسان کے دل و دماغ میں انسانی عزّ و شرف کا احساس پیدا کرے گا اور اُسے زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار سے آشنا کرے گا اور اُسے اس ذلت و رسوائی سے نجات دلائے گا جو ڈارون اور کارل مارکس وغیرہ کے باطل نظریات نے اس پر مسلط کر دی ہے۔ پھر انسان کے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ وہی اشرف المخلوقات ہے اور آلات، مادی ایجادات اور تہذیب کو اس کے تابع ہونا چاہیے۔

جب دولتِ ایمان سے سرفراز رُوحِ انسانی مادی اشیاء پر تصرف حاصل کرے گی تو عقیدہ و ایمان کی حدود میں رہ کر صحیح طور پر آزادی و اختیار سے متمتع ہوگی۔ یہی اختیار وہ اہم چیز ہے جس سے آج کی انسانی رُوح محروم ہے۔ وہ مشین اور مشینی دور کے باطل افکار و نظریات کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔

ارادہ و اختیار کی آزادی سے رُوحِ مومن کے ہاتھ ایک ایسی قوت آجائے گی جو

موجودہ تہذیب و تمدن کو ضرر رساں عناصر سے پاک کر کے ایسے صالح عناصر کی نشو و نما کا سبب بنے گی جو وجودِ انسانی کی حقیقی ضروریات سے ہم آہنگ ہوں۔ اسی طرح رُوحِ مومن کی بالادستی انسان کو اُن حالات سے جو انسانی عزت و تکریم کی ضد ہیں۔ پیدائشِ دولت کے اُن طریقوں اور محنت کے اُن طریقوں سے نجات دلائے گی جن میں انسانی اقدار رُو بہ زوال ہیں۔

ذرائع پیداوار اور محنت کے مختلف طریقے کوئی مقدس ضابطے نہیں ہیں! وہ تو صرف انسانی شرافت کی اعلیٰ اقدار کو بالکل نظر انداز کر کے مادی پیداوار کو بڑھانے کے استعمالی وسائل ہیں۔ جب یہ بات طے ہو جائے گی کہ "انسان" مادی اشیا سے زیادہ معزز اور گراں قدر ہے تو پیداوار بڑھانے کے طریقے اور محنت و عمل کے طریقے کچھ اس طرح بدل جائیں گے کہ پیداوار کی زیادتی اور انسانی شرافت کی اعلیٰ اقدار کے درمیان کامل ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی نظامِ زندگی کے سرچشمے سے پھوٹنے والے نئے تصورات و اقدار کے فروغ اور اس کے بعد نورِ ایمان سے منور رُوحِ انسانی کی صنعتی تہذیب اور اس کے مختلف طریقوں پر بالادستی اور اس بالادستی کے نتیجے کے طور پر ارادہ و اختیار کی جو آزادی مومن کو حاصل ہو گی اس کے بعد ہی علمِ انسانی کا مزید مطالعہ کسی اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہے اور اسی طرح مسٹر ڈلس کی اُس پکار کا جواب مہیا ہو سکتا ہے جو وہ ایک ایسے نظام کے لیے بلند کر رہے ہیں جس کی خصوصیات وہ بیان کرتے ہیں مگر وہ اُن کے سامنے موجود نہیں اور نہ کلیسا اور اس کے رُوحانی پیشوا اسے پیش کر سکتے ہیں۔

حُسنِ اتفاق سے فطرتِ انسانی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا ہے، کائنات کی فطرت سے پُوری طرح ہم آہنگ ہے اور فطرتِ کائنات میں بھی انسانی فطرت کی طرح حرکت، تخلیق، نمو پذیری اور ارتقاء کے عناصر موجود ہیں۔ اس بنا پر وثوق سے کہا جا سکتا ہے

کہ فطرتِ انسانی موجودہ تہذیب و تمدن کے بیشتر حصے کو اپنی حقیقی اور ارتقاء پذیر ضروریات
سے ہم آہنگ پائے گی اور اس کے وہی عناصر اس سے متصادم ہوں گے جو خود وجود
نسانی کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ اُن سے گلوخلاصی اور نجات ضروری ہے۔
ں کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظامِ زندگی یعنی یہ دینِ اسلام انسانیت کا نجات دہندہ
پنے اُوپر لیتا ہے۔ اہلِ مغرب اس نجات دہندہ کے طلب گار ہیں مگر اُسے قبول کرنے
سے انکار کرتے ہیں۔

مستقبل کی باگ صرف اللہ کے دین کے ہاتھ میں ہے

یہ حقیقت پوری منکشف ہو گئی ہے کہ اسلام ہی نوعِ بشری کو اُن تباہ کن خطرات سے نجات دلا سکتا ہے جو نظر کو خیرہ کر دینے والی مادی تہذیب کی جلو میں اس کی طرف کشاں کشاں بڑھ رہے ہیں اور اسلام ہی انسانیت کو ایک ایسا نظامِ زندگی عطا کر سکتا ہے جو اس کی فطرت اور حقیقی ضروریات کے مطابق ہو۔ وہی اس کی مادی ایجادات میں ترقی اور رُوحانی اور اخلاقی ارتقاء میں ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے اور اسلام ہی وہ دین ہے جو زندگی کا ایک ایسا واقعی نظام قائم کر سکتا ہے جو مادی ترقی اور رُوحانی ترقی میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دے گا جس کی مثال ساری تاریخِ انسانی میں سوائے نظامِ اسلامی کے کہیں نہیں مل سکتی۔

مذکورہ بالا مسلّمہ حقائق کے بعد اس جُرم کے گھناؤنے پن سے بھی پردہ اُٹھ جاتا ہے جس کا ارتکاب ساری انسانیت کے خلاف وہ لوگ کر رہے ہیں جو ہر جگہ تحریکِ اسلامی کے علمبرداروں کو نقصان پہنچانے کے لیے کاری ضربیں لگا رہے ہیں۔ ان لوگوں میں مسٹر ڈلس پیش پیش ہیں جو اس جیسے کسی نظام کے لیے نوا سنج فغاں ہیں اور وہ لوگ اس جُرم کا ارتکاب کر رہے ہیں جو اسلامی نظام کے آثار و نقوش مٹانے اور راہِ نجات کی متلاشی نوعِ انسانی کی آنکھوں سے اسلام کو اوجھل کر دینے اور کسی "نجات دہندہ" کے

لیے سراپا انتظار انسانیت کو مختلف حیلوں بہانوں اور مکر و فریب کے ہتھکنڈوں کے ذریعے اس کو اسلام سے دُور کر دینے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہے ہیں۔

یہ ساری انسانیت کے خلاف ایک نہایت گھناؤنا جرم ہے۔ اس مظلوم انسانیت کے خلاف جو مغرب کی خلافِ فطرت تہذیب اور مادہ پرستانہ تمدن سے تنگ آچکی ہے، بقول ڈاکٹر کیرل کے جو مادی فلسفے کے غلبے کی زد میں ہے اور بقول مسٹر ڈلس کے جو آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی مادی تہذیب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی کشاں کشاں تباہی و بربادی کے گڑھے کی طرف بڑھ رہی ہے یعنی وہ ہر لمحہ اس خوفناک تباہی و بربادی کے گڑھے سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے جس سے نجات کی راہ سوائے دینِ اسلام کے کہیں نہیں۔ مگر انسانیت کے دُشمن رُوئے زمین پر ہر جگہ مختلف سازشوں اور حیلوں بہانوں کے ذریعے اسلام سے برسرِ پیکار ہیں۔

مگر انسانیت کے دُشمنوں نے اسلام کے خلاف جو طوفان برپا کر رکھا ہے وہ ہمارے اس پختہ یقین کو کبھی متزلزل نہیں کر سکتا ہے کہ انسانیت کے مستقبل کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھ میں ہے۔

اسلام تو اپنی طویل زندگی میں اُن وحشیانہ ضربوں سے بھی زیادہ سخت معائب و شدائد کے مقابلے میں ڈٹا رہا ہے جن سے آج تحریکِ اسلامی کے علمبرداروں کو ہر مقام پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس نے اپنی ذاتی قوت کے بل بوتے پر ہی جدوجہد کی ہے اور فتحیاب ہو کر خود بھی قائم رہا ہے اور اُن قوموں اور ملکوں کے وجود کو بھی برقرار رکھا ہے جو اس کی حفاظت میں تھے۔ حالانکہ وہ بے تیغ و تبر تھا!

یہ اسلام ہی تھا جس نے مشرق میں اسلامی ملکوں کو تاتاری یورشوں سے اور اہلِ صلیب کے

حملوں سے بچایا۔ اگر اہل صلیب مشرق میں اسی طرح کامیاب ہو جاتے جیسا کہ اندلس میں ہوئے تھے اور جس طرح کہ یہودی فلسطین میں کامیاب ہو گئے تھے تو آج نہ عرب قومیت باقی رہتی اور نہ عرب موجود ہوتے بلکہ عرب ممالک بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہوتے۔ ماضی میں اُندلس اور حال میں فلسطین دونوں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جب کسی خطۂ ارضی سے اسلام کی بیخ کنی کر کے اُسے دیس نکالا دے دیا گیا تو اس مُلک میں نہ زبان باقی رہی نہ قومیت۔ وہ ممالک جنہوں نے اس خطۂ ارضی کو تاتاریوں کے حملوں سے بچایا وہ عرب نہیں بلکہ تاتاری ہی تھے، مگر وہ اپنے ہم جنس تاتاری حملہ آوروں کے خلاف اسلامی حمیت سے سرشار ہو کر ڈٹ گئے کیونکہ وہ مسلمان تھے اور ان کی قوت و طاقت کا سرچشمہ عقیدۂ اسلامی تھا اور وہ ایک مسلمان امام ربانی ابن تیمیہؒ کی رُوحانی قیادت میں لڑ رہے تھے جو لشکرِ اسلام کی اگلی صفوں میں شامل ہو کر جہاد کر رہے تھے۔

صلاح الدین ایوبیؒ نے اس خطۂ ارضی سے عرب قومیت اور عربی زبان کو مٹنے سے بچایا۔ حالانکہ وہ کُردی النسل تھے، عرب نہیں تھے۔ مگر انہوں نے اہلِ صلیب کی یورشوں سے نہ صرف اسلام کی حفاظت کی بلکہ عربی زبان اور عرب قومیت کی پاسبانی کا بھی حق ادا کیا۔ ان کے دل میں اسلام ہی ایک محرک قوت تھا جو اہلِ صلیب سے نبرد آزما ہوا۔ اسی طرح ظاہر بیبرس، مظفر قطز اور ملک ناصر کے دلوں میں بھی اسلام ہی تھا جو تاتاریوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوا۔

اسلام ہی تھا جو الجزائر میں ڈیڑھ سو سال تک کفر کے خلاف برسرِ پیکار رہا اور اسی نے وہاں عربیت کا علم بلند رکھا حتیٰ کہ جب وہاں عربی زبان و ثقافت کی اقدار بالکل مٹا دی گئیں اور فرانس نے عربی زبان کو اجنبی زبان قرار دے کر الجزائر میں اس کے پڑھنے پڑھانے

پر پابندی لگادی، تو وہاں اسلام ہی الجزائریوں کے دلوں میں بیدار ہوا اور مخالفین سے پنجہ آزمائی کر کے اُن پر غلبہ حاصل کیا اور ان کے سامنے کبھی سرنگوں نہ ہوا کیونکہ اس کے دشمن اہلِ صلیب تھے۔ اسی اسلام کی وجہ سے الجزائر میں رُوحِ جہاد زندہ و باقی رہی جس میں عبدالحمید بن بادیس کی تحریکِ اسلامی نے نئی حرارت پیدا کی اور اس کی روشنی کی لو کو اور بھی تیز کیا۔ یہ حقیقت جسے مسلمانوں کے بعض گمراہ اور بیوقوف لوگ مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اسے اہلِ فرانس اور اہلِ صلیب خُوب جانتے ہیں کیونکہ وہ سب اہلِ صلیب ہیں! انہیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ اسلام ہی ہے جو الجزائر میں اُن کے ناپاک عزائم کی تکمیل کی راہ میں حائل ہے۔ اس لیے وہ صرف عربوں یا الجزائریوں کے خلاف نہیں بلکہ "قومِ مسلم" کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔

اور اسلام ہی تھا جو اس بغاوت میں محرک قوت کا کردار ادا کر رہا تھا جو مہدی سوڈانی نے پہلے مصر میں، پھر سوڈان میں برطانوی تسلط کے خلاف کی تھی۔ مہدی سوڈانی کے اعلانات اور عثمان دُقنہ کے کچھ، کردمراد اور توفیق کے نام خطوط کو دیکھنے سے اس محرکِ اصلی یعنی اسلام کے مؤثر ہونے کی شہادت مل جاتی ہے۔

اور اسلام ہی تھا جو برقہ اور طرابلس میں کُفر کے خلاف نبرد آزما ہوا اور جس کی بدولت سنوسی تحریک کے مراکز میں جذبۂ جہاد کی تخم ریزی ہوئی اور اسی نورِ خدا سے عمر مختار کا جذبہ جہاد منور تھا۔

مراکش میں آزادی کی جو تحریک یکایک اٹھی اس کا سرچشمہ بھی اسلام ہی تھا۔ فرانسیسی حکمرانوں نے جب ۱۹۳۱ء میں "الظہیر البربری" کے نام سے ایک عجیب و غریب قانون نافذ کر کے اس امر کی کوشش کی کہ بربری قبائل کو اسلام سے برگشتہ کر کے انہیں بتوں کا پرستار بنا دیا جائے

تو اسلام ہی نے اہلِ مراکش کو فرانسیسیوں کے خلاف اُبھارا تھا۔

اسلام نے کفر کے خلاف خُوب جدو جہد کی ہے حالانکہ وہ بالکل بے تیغ و تبر تھا۔ اس کی اصل قوت تیغ و تبر میں نہیں بلکہ اپنی سادگی، جامعیت، فطرتِ بشری سے کامل ہم آہنگی اور انسان کی حقیقی ضروریات کو پُورا کرنے کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے اور اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے ہم جنس انسانوں کی عبادت کی پستی سے نکال کر اللہ رب العالمین کی عبادت کی سر بلندی سے سرفراز کرتا ہے اور انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کے بارے میں رُشد و ہدایت کے لیے ساری دُنیا کو چھوڑ کر اُسی ذاتِ بے ہمتا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسی طرح اس کی اصل قوت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ پیش آمدہ حالات (مثلاً کسی غیر مُسلم طاقت کے زیرِ نگین ہو جانا) میں اپنے ماننے والوں کو بالکل بلند و بالا رکھتا ہے۔ اس طرح کسی بیرونی طاقت کا تسلط و اقتدار کسی مسلمان کے قلب و ضمیر پر نہیں رہتا خواہ اس اقتدار کا دباؤ کتنا ہی سخت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک قلب و ضمیر اسلام سے معمور رہتے ہیں تو اگرچہ بعض اوقات مُسلمان ظاہری طور پر شکست کھا جاتا ہے مگر رُوحانی طور پر وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔

اسلام کے ان خصائص کی وجہ سے اس کے دُشمن اس کے خلاف برسرِ پیکار ہیں کیونکہ وہ اُن کے لیے سنگِ راہ بن جاتا ہے اور اُن کے استعماری و استحصالی عزائم کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ وہ رُوئے زمین پر اُن کی سرکشی کو روکتا اور ان کی جھوٹی خدائی کا ابطال کرتا ہے۔

اسلام کے یہی وہ خصائص ہیں جن کی وجہ سے دُشمنانِ اسلام اس کا قلع قمع کر دینے کے لیے اس پر مختلف طریقوں سے مثلاً اس کی تعلیمات کو غلط رنگ دے کر پیش کرنا اور مسلمانوں کو مکر و فریب کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش کرنا، اس پر حملے کرتے رہتے ہیں۔

وہ اس کے اساسی تصورات اور اقدار کو اُن تصورات واقدار سے بدل دینا چاہتے ہیں جن کا اُن کے اس سخت جان مدمقابل (یعنی اسلام) سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ تاکہ عالمی صیہونیت عیسائیت اور استعماریت اس سے پیچھا چھڑا سکیں۔

اسلام کی یہی خصوصیات دُشمنوں کے غیظ وغضب کو بھڑکاتی ہیں اور وہ طیش میں آ کر دُنیائے اسلام پر عرصۂ حیات تنگ کرنے لگتی ہیں۔ اسلام اور کُفر کے درمیان جو معرکہ برپا ہے یہ اس کی اصل نوعیت ہے۔

اسلام کے لیے حالات اگرچہ سازگار نہیں مگر اس کے باوجود انسانیت کا مستقبل بلاشبہ اللہ کے دین کے ہاتھ میں ہے۔ جب ہم اس دین کے پیش کردہ نظامِ زندگی کے مزاج اور اس بات پر غور کرتے ہیں کہ انسانیت کو ایسے نظامِ زندگی کی کتنی ضرورت ہے، تو ہمیں پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ انسانیت کا مستقبل اللہ کے دین کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ اس رُوئے زمین پر فلاحِ انسانی کے لیے ایک اہم کردار ادا کرنے کے لیے بہرحال اس دین کی دعوت دی جائے گی خواہ اس کے دُشمن پسند کریں یا نہ کریں۔ ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نوعِ بشری طویل مُدت تک اللہ کے اس دین سے بے نیاز رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہمیں اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں؛ البتہ ہم یہاں تاریخِ اسلام سے ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو شاید اس مقام پر موزوں ترین مثال ہو۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جاں نثار ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب قریش کی نظروں سے بچ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور سُراقہ بن مالک قریش کے انعام واکرام کے لالچ میں آ کر اُن کا تعاقب کر رہا تھا اور جب بھی وہ ان دو بزرگ ہستیوں کے قریب ہوتا تو اس کا گھوڑا بدک جاتا اور جب وہ خود کو بے بس پا کر نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم سے یہ معاہدہ کر کے واپس جانے ہی والا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اے سراقہ! تیرا اور کسریٰ کے کنگنوں کا معاملہ کیا ہوگا!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُراقہ کو کسریٰ شہنشاہ فارس کے کنگن پہننے کی خوشخبری دے رہے تھے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت سُراقہ کے دل و دماغ میں اس عجیب و غریب پیشکش کے متعلق کیسے کیسے خیالات موجزن تھے جو ایک ایسے یگانہ روزگار کی طرف سے کی گئی تھی جن کے پیچھے سوائے ایک ساتھی کے، جو ان کے لیے بالکل کافی نہیں تھا اور جس کے ساتھ وہ خفیہ طور پر ہجرت کر کے جا رہے تھے، ساری قوم پڑ گئی تھی۔

مگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم حق کی اس قوت کو خوب پہچانتے تھے جس کے ساتھ انہیں دُنیا میں مبعوث فرمایا گیا تھا اور اس باطل سے بھی خوب آگاہ تھے جس کی وجہ سے اس وقت ساری دُنیا جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی اور اُنہیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ حق لازماً باطل پر غالب آئے گا اور یہ ناممکن ہے کہ حق اور باطل دونوں ایک دُوسرے کے پہلو بہ پہلو زندہ رہیں۔ باطل کی جڑیں اس حد تک کھوکھلی ہو چکی تھیں کہ ان کو کسی قسم کی آبیاری اور کھاد وغیرہ زندہ نہیں رکھ سکتی تھی اور جڑیں اتنی بوسیدہ ہو چکی تھیں کہ ان کو اکھاڑ پھینکنا بالکل لازمی ہو گیا تھا اور حق کا پاکیزہ اور مقدس بیج آپؐ کے ہاتھ میں تھا جس کی تخم ریزی بنی نوع انسان کے دلوں میں ہونی تھی اور اُسے پھل پھول کر ایک عظیم درخت بننا تھا اور جس کے بارآور ہونے کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پختہ یقین تھا۔

آج ہم بھی اُسی قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے اردگرد بھی اُسی طرح جاہلیت پھیلی ہوئی ہے، لہٰذا ہمیں بھی حق کے غالب ہونے کے متعلق بے یقین ... ہونا چاہیے۔ حالات بتاتے ہیں کہ موجودہ بظاہر مایوس کن فضا میں حق غالب ہوگا۔

نوعِ انسانی کو اس نظامِ زندگی کی آج جتنی ضرورت ہے وہ کچھ اس سے کم نہیں
تھی کہ آفتابِ نبوت کے چمکنے سے پہلے تھی یہ آج بھی دوسرے سارے ادیان پر تفوق و برتری
دکھتا ہے اس کی عظمت و اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ہمیں اس بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ اس قسم کے حالات
میں جو کچھ ایک مرتبہ وقوع پذیر ہو چکا ہے لازماً دوبارہ بھی ہو سکتا ہے (یعنی غلبہ حق اور
شکستِ باطل) اور آج کل تحریکِ اسلامی کے علمبرداروں پر جو وحشیانہ ضربیں مختلف باطل
قوتوں کی طرف سے لگائی جا رہی ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ مادی تہذیب جن بنیادوں پر استوار
ہے وہ بڑی عظیم ہیں۔ ان باتوں سے ہمیں غلبہ حق کے بارے میں بالکل شک و شبہ کا شکار
نہیں ہونا چاہیے۔ معرکۂ خیر و شر میں باطل کا بڑا ہونا یا اسلام پر لگائی جانے والی وحشیانہ ضربوں
کی قوت فیصلہ کن کردار ادا نہیں کرتی بلکہ اصل فیصلہ کن کردار حق کی قوت اور باطل کی طرف سے
لگائی جانے والی تباہ کن ضربوں کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کی ہمت ادا کرتی ہے۔

ہم علمبردارانِ حق اکیلے نہیں ہیں۔ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسانی کی قوتیں ہمارے
ساتھ ہیں۔ یہ قوتیں ہر اس چیز سے بڑی ہیں جو خلافِ فطرت مادی تہذیب فطرت پر دباؤ ڈالنے
کی کوشش کرتی ہے اور جب تہذیب اور فطرت باہم دگر دست و گریباں ہوں تو فطرت
کا کامیاب ہونا خداوندِ جہاں کی طرف سے مقدر کر دیا جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ فطرت و
تہذیب کی یہ سر پھٹول تھوڑے عرصہ کے لیے جاری رہتی ہے یا زیادہ عرصہ کے لیے۔

موجودہ حالات میں ایک بات ہمارے پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ ہمیں اس وقت
ایک زبردست کٹھن اور صبر آزما مقابلہ درپیش ہے۔ ہم فطرتِ انسانی کو موجودہ تہذیب کی
ناروا پابندیوں سے آزاد کرا کے موجودہ تہذیب پر اس کی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک ایسا شدید مقابلہ ہے جس کے لیے ہمیں بڑی طویل تیاری کی ضرورت ہے۔

ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس دین کے معیار پر پُورا اُترنے کے لیے تیار رہیں۔ ہمارا ایمان باللہ اور ہماری معرفتِ الٰہی اس دین کے معیار کے مطابق ہو۔ کیونکہ جب تک ہمیں خالقِ کائنات کی پُوری معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ ہم صحیح طور پر ایمان کے تقاضے پُورے نہیں کر سکیں گے۔

ہم پر لازم ہے کہ اپنی عبادات میں اس دینی معیار کو ملحوظ رکھیں۔ کیونکہ جب تک ہم خداوندِ عالم کی عبادت کا حق صحیح طور پر ادا نہیں کریں گے ہم کما حقہٗ اس کی معرفت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ماحول کو سمجھنے اور اپنے دَور کے تقاضوں کو جاننے میں بھی اس دینِ حق کے معیار پر پُورا اتریں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی بارش کرے اس شخص پر جس نے اپنے عہد کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور راہِ راست پر قائم رہا۔

ہمیں اپنے دَور کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے اَور دیکھنے پَرکھنے میں بھی اس دینِ اسلام کے معیار کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کیونکہ جب تک ہم علم و تجربہ کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس تہذیب و ثقافت کو اپنے تابع نہیں کریں گے ہم اس بات کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ اس میں سے کن چیزوں کو اپنایا جائے اور کن کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ علم و تجربہ ہی ہمیں حسن و قبح میں تمیز کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

حیاتِ بشری کے مزاج اور اس کی تازہ بہ تازہ حقیقی ضروریات کو سمجھنے میں بھی اس دین کے معیار کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ہم تہذیبِ حاضر میں سے جو کچھ چھوڑیں وہ زندگی اور تہذیب کو علم و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر چھوڑیں اور اس تہذیب میں سے جن اقدار کی بقا

چاہیں وہ بھی علم و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر چاہیں۔
یہ ایک بڑا شدید اور صبر آزما معرکۂ حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا معرکہ ہے۔
اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ اپنے امر (یعنی غلبہ حق اور شکستِ باطل) پر غالب ہے اور اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اسلام کا روشن مستقبل

المستقبل لهذا الدين

سید قطب شہید — مترجم۔ عبدالحمید صدیقی

ادارہ معارفِ اسلامی، کراچی

البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور